الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

جذبات سے مغلوب ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی ہوتا ہے
اور جذبات کو قابو میں رکھ کر عمل کرنے کا نتیجہ ہمیشہ کامیابی۔

دسمبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ ۔ تین روپے □ شمارہ ۸۵

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۲
شمارہ ۸۵

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

الرسالہ (انگریزی)

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن انشاء اللہ جنوری ۱۹۸۴ میں شائع ہوگا۔ اس کی قیمت فی شمارہ ۳ روپیہ اور سالانہ ۳۶ روپیہ ہوگی۔ ایجنسی وغیرہ کے شرائط وہی ہوں گی جو اردو الرسالہ کی ہیں۔

انگریزی الرسالہ کی ترتیب وادارت کے لئے ایک لائق مسلم خاتون (محترمہ فریدہ خانم صاحبہ) کی مستقل خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ موصوفہ ہر اعتبار سے اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

محترمہ فریدہ خانم صاحبہ نے بی اے انگلش آنرز سے کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے دو مضامین سے ایم اے کیا۔ پہلے انگلش میں اس کے بعد اسلامیات میں۔ اسلامیات میں ان کا نتیجہ فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ اردو اور انگریزی کے علاوہ وہ عربی فارسی اور ہندی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتی ہیں۔ موصوفہ اس وقت دہلی کی ایک یونی ورسٹی میں اپنا ڈاکٹریٹ کا تھیسس تیار کر رہی ہیں، جس کا موضوع ہے —— دور جدید کی اسلامی تحریکیں۔

موصوفہ انگریزی زبان کا اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ الرسالہ کے مقاصد سے انھیں گہری وابستگی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ پچھلے تقریباً دس سال سے اسلامی مشن کے میدان میں خاموش خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔

الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن زیادہ تر اردو الرسالہ یا ادارۂ الرسالہ کی اردو مطبوعات کے ترجمے پر مشتمل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو ان اصحاب کے قلمی تعاون کی ضرورت ہے جو انگریزی تحریر پر بخوبی قدرت رکھتے ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہماری اپیل ہے کہ وہ الرسالہ یا ہماری دوسری اردو مطبوعات سے انگریزی ترجمے کرکے روانہ فرمائیں۔ ہم ایسے لوگوں کے انتہائی مشکور ہوں گے۔ جو اصحاب انگریزی ترجمے کے کام میں معاونت فرمائیں ان سے گزارش ہے کہ ہر ترجمہ، خواہ وہ الرسالہ سے لیا گیا ہو یا کسی کتاب سے، اس کا مکمل حوالہ ضرور درج کریں۔

منیجر الرسالہ۔ جمعیۃ بلڈنگ۔ قاسم جان اسٹریٹ۔ دہلی ۶

نماز کو دیکھ کر

ہنری دی کیسٹرو (Henry de Castro) ایک فرانسیسی افسر تھا۔ الجزائر میں فرانسیسی اقتدار کے زمانہ میں وہ ایک بڑے سرکاری عہدہ پر متعین ہو کر آیا۔

ہنری دی کیسٹرو ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ۲۰ عرب سوار بھی تھے جو اس کے ماتحت تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اتنے میں عصر کا وقت آگیا۔ انھوں نے اپنے افسر سے کہا لقد حان موعد صلوٰۃ العصر (عصر کی نماز کا وقت آگیا) اور افسر کی اجازت کا انتظار کئے بغیر اپنے گھوڑے سے اتر گئے۔ اس کے بعد انھوں نے صحرا میں بلند آواز سے اذان دی اور صف باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔

فرانسیسی افسر کو یہ طرز عمل اپنی ہتک معلوم ہوا۔ تاہم وہ چپ رہا اور اپنا گھوڑا روک کر عربوں کی کارروائی دیکھتا رہا۔ صف بستہ نماز کا منظر اسے بے حد متاثر کر رہا تھا۔ جب وہ لوگ نماز پڑھ چکے تو اس نے ان لوگوں سے نماز کے متعلق سوالات شروع کر دئے۔ اور ان کے جوابات کو بغور سنتا رہا۔

ایک طرف عربوں کی جرأت دوسری طرف نماز باجماعت کا منظر، ان چیزوں نے اس کو شدید طور پر متاثر کیا۔ واپس آکر اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس نے قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پڑھا۔ عرب میں عرصہ تک سفر کر کے مسلمانوں کو دیکھا۔ اس کا تاثر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے اسلام پر فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا عربی ترجمہ مشہور مصری ادیب فتحی زغلول نے کیا۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور اس کا نام ہے ——
الاسلام؛ خواطر و سوانح

فرانسیسی افسر نے الجزائریوں کے عمل کو اولاً اکڑ کا معاملہ سمجھا تھا۔ اس لئے اس کے اندر بھی اکڑ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ مگر الجزائری جب گھوڑوں سے اتر کر رب العٰلمین کے آگے جھک گئے تو اس کو معلوم ہوا کہ الجزائریوں نے جو کچھ کیا وہ اکڑ کے لئے نہ تھا۔ بلکہ جھکنے کے لئے تھا۔ اب اس کی فطرت جاگ اٹھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے اندر بھی خدا کے آگے جھکاؤ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے دین میں داخل ہو گیا۔

مغربی قومیں

صلیبی لڑائیوں میں مسلمانوں نے یورپ پر فتح پائی۔ مگر اس کے بعد یورپ میں اسی طاقت سے اسلام کی اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یورپی قوموں میں صلیبی جنگوں (کروسیڈس) کی تلخ یاد ہے صلیبی لڑائیوں میں یورپ کو اسلامی دنیا کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں یوروپی قوموں کے اندر اسلام کے خلاف نفرت اور تعصب پیدا ہو گیا۔ یہی صلیبی نفرت ہے جو یورپ میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی اشاعت میں مانع رہی۔

تاہم پچھلی صدیوں میں جب یورپ نو آبادیاتی طاقت بن کر ابھرا تو وہاں کی فضا بدل گئی۔ اب یورپ نے صلیبی شکست کا بدلہ مسلمانوں سے لے لیا تھا۔ کیونکہ مسلم دنیا کے بڑے حصہ پر یورپی قوموں کا براہ راست یا بالواسطہ اقتدار قائم ہو گیا۔

مفتوح کے اندر فریق ثانی کے لئے نفرت کے جذبات ہوتے ہیں۔ اس لئے مفتوح فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس فاتح کی نفسیات میں بے نیازی ہوتی ہے۔ اس لئے اسے فریق ثانی کی کسی چیز کو قبول کرنے میں کوئی نفسیاتی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جب نو آبادیاتی دور آیا تو یورپ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے زبردست امکانات پیدا ہو گئے۔ "مفتوح" یورپ میں اسلام کی اشاعت مشکل تھی، مگر "فاتح" یورپ میں اسلام کی اشاعت اتنی ہی آسان ہو چکی تھی۔

مگر اب یہاں ایک اور نفرت رکاوٹ بن گئی۔ پہلے جو چیز۔ یورپی قوموں کی طرف سے تھی وہی چیز اب خود مسلم قوموں کی طرف سے پیدا ہو گئی۔ نو آبادیاتی دور میں چونکہ یورپ نے مسلم قوموں کو سیاسی اور تہذیبی شکست دی تھی، اس لئے مسلمانوں کے اندر یورپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ وہ یورپی قوموں کو مادی رقیب اور قومی حریف کی نظر سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے ان کو نفرت کی نظر سے دیکھا نہ کہ ہمدردی کی نظر سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نو آبادیاتی دور میں بھی یورپ کو خدا کے دین کا مخاطب نہ بنا سکے۔ مسلمانوں اور یورپی قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ ماضی میں ایک سبب سے قائم نہ ہو سکا اور حال میں دوسرے سبب سے

مسجد کو دیکھ کر

مولانا محمد علی ہندستانی مسلمانوں کے انتہائی مشہور لیڈر تھے۔ ان کے زمانہ میں دہلی کے ایک مسلمان پینٹنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ مختلف تصویریں بنا کر بیچتے تھے۔ یہی ان کا معاشی ذریعہ تھا۔

ایک بار انھوں نے ایک تصویر بنائی اور یہ تصویر مولانا محمد علی کے سامنے پیش کی تاکہ وہ اس کو خرید لیں۔ اس تصویر میں جامع مسجد دہلی کو دکھایا گیا تھا۔ دہلی کی جامع مسجد کافی اونچائی پر ہے اس کی سیڑھیوں کا عام منظر گداگروں کی موجودگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے جو تصویر بنائی اس میں مسجد کے ساتھ یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ اس کی سیڑھیوں پر ایک بھیک مانگنے والی عورت اپنے ایک بچہ کو لئے ہوئے کھڑی ہے۔

محمد علی نے تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ایک شرط پر اس کو خرید لوں گا۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم تصویر کے نیچے یہ جملہ لکھ دو کہ اس کے آباء و اجداد نے اسے بنایا تھا:

Her fathers built it

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم لیڈر مختلف ملکوں میں اٹھے وہ کس چیز سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ وہ دراصل اپنے کھوئے ہوئے ماضی کے لئے بےچین تھے اور اس کو واپس لانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریکوں کو اگرچہ احیاء اسلام کا عنوان دیا۔ مگر ان کی تحریک کا نشانہ ان کا سیاسی ماضی تھا نہ کہ حقیقۃً احیاء اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں کی یہی نفسیات تھی جس کی وجہ سے وہ کوئی دوررس تعمیری کام نہ کر سکے۔ مثلاً دہلی میں "گذرے ہوئے دور" کی بنی ہوئی کم از کم ایک سو نہایت بڑی مسجدیں تھیں۔ جن میں سے اکثر نیم آباد یا غیر آباد پڑی ہوئی تھیں۔ ان مسجدوں میں اکثر کے پاس بڑی بڑی ملحق زمینیں بھی تھیں۔ یہ لیڈر ان مسجدوں کو مرکز بنا کر زبردست دعوتی اور تعمیری کام کر سکتے تھے۔ مگر وہ مسلمانوں کے سیاسی ماضی کو واپس لانے کے لئے بے فائدہ قربانیاں دیتے رہے اور اس قسم کے تعمیری امکانات غیر استعمال شدہ پڑے رہ گئے۔

ایک مسلمان جو قومی ذہن رکھتا ہو وہ دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کو دیکھ کر صرف اپنے سیاسی ماضی کو یاد کرے گا۔ مگر جو مسلمان دعوت و تبلیغ کا ذہن رکھتا ہو وہ جب اس قسم کی عمارتوں کو دیکھے گا تو اس کے اندر یہ جذبہ بھڑک اٹھے گا کہ یہاں دوسری قوموں تک خدا کے دین کا پیغام پہنچانے کا مرکز قائم کیا جائے۔

رسول خدا کا اسوہ

قدیم عرب میں کعب بن زُہیر ایک شاعر تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو کعب آپ کے مخالف ہو گئے۔ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشعار لکھتے اور لوگوں کے درمیان ان کو پھیلاتے۔ ان اشعار میں نہایت برے انداز میں آپ کی ہجو اور تنقید ہوتی۔

جب مکہ فتح ہو گیا تو کعب بن زہیر کو اپنے لئے زمین تنگ دکھائی دینے لگی۔ ان کے بھائی بُجیر اسلام قبول کر چکے تھے۔ انھوں نے کعب سے کہا کہ مدینہ جاؤ اور اسلام قبول کر لو۔ اب اسی میں تمھارے لئے بھلائی ہے۔ کعب بن مالک کے خط کا ایک فقرہ یہ تھا کہ اگر تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے یہاں حاضر ہو جاؤ۔ کیوں کہ وہ کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کے پاس تائب ہو کر آئے۔ (فان كانت لك من نفسك حاجة فطِرْ الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فانه لا يقتل احداً جاء تائباً، سيرة ابن هشام)

چنانچہ کعب بن زہیر مدینہ آئے۔ اگلے دن صبح سویرے وہ مسجد نبوی پہنچے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ختم کی تو انھوں نے آگے بڑھ کر آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو پہچانتے نہ تھے۔ کعب نے آپ سے کہا کہ میں کعب بن زہیر ہوں۔ میں تائب ہو کر اور مسلمان ہو کر آیا ہوں۔ آپ سے امان مانگتا ہوں۔ کیا اس کو آپ میری طرف سے قبول کریں گے اور امان دے دیں گے۔

یہ سن کر مدینہ کا ایک مسلمان صف سے اٹھا اور جھپٹ کر کعب تک پہنچا۔ اور کہا کہ اے خدا کے رسول اس دشمن خدا کو میرے حوالے کیجئے تاکہ میں تلوار سے اس کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کہا: اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ وہ توبہ کر کے اور اپنی حرکت سے باز ہو کر آیا ہے (دعه عنك فانه قد جاء تائباً نازعاً عمّا كان عليه)

یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ اس سے ناقدین اور مخالفین کے بارہ میں اسلام کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی تخریبی ہو اور وہ کتنا ہی تنقید یں کرتا رہا ہو۔ اگر وہ اپنے فعل کو چھوڑ دے اور تائب ہو کر امن کی درخواست کرے تو اس کو ضرور امن دیا جائے گا۔ ماضی کے تخریبی عمل کی بنیاد پر اس کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کی توبہ ہی اس کے لئے سزا کا بدل بن جائے گی۔

اسلامی طریقہ

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ بتوں کو توڑ دیا جائے۔ مثلاً مسند احمد کی ایک روایت حسب ذیل ہے:

عن ابی محمد الھذلی عن علی قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی جنازۃ فقال ایکم ینطلق الی المدینۃ فلا یدع بہا وثنا الا کسرہ ولا قبراً الا سوّاہ ولا صورۃ الا لطخہا

ابو محمد ہذلی علی بن ابی طالب سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں تھے۔ آپ نے کہا تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور وہاں کوئی بت نہ چھوڑے جس کو اس نے توڑ نہ دیا ہو۔ اور کوئی قبر نہ چھوڑے جس کو اس نے برابر نہ کر دیا ہو۔ اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جس کو اس نے مٹا نہ دیا ہو۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور طائف اور دوسرے مقامات کے بتوں اور مجسموں کو توڑا۔ مگر اس عمل کا تعلق صرف عرب سے تھا۔ عرب کو چونکہ خدا کے حکم کے مطابق شرک اور آثار شرک سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے وہاں کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا۔ تاہم اس قسم کی تمام کارروائیاں فتح کے بعد ہوئیں، نہ کہ فتح سے پہلے۔

عرب کے علاوہ دوسرے مقامات کے لئے یہ اصول نہ تھا کہ وہاں کے بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے۔ دوسرے ملکوں میں صرف تبلیغ کے اصول پر عمل کیا گیا اور سرکاری طور پر بتوں کو توڑنے کے بجائے اس کا انتظام کیا گیا کہ غیر مسلم اقوام مسلمان ہو جائیں اور اس کے بعد اپنے آپ ان کے بتوں کا خاتمہ ہو جائے۔

حضرت عمر بن خطاب کی خلافت کے زمانہ میں بہت سے عیسائی علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ مگر ان کے بتوں کو توڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ مسلمان ایسے مکان یا عبادت گاہ میں داخل ہونے سے بچتے تھے۔ وہ ایسے لوگوں پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے مگر اقتدار کے باوجود انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کے بتوں کو توڑنے لگیں۔ ایک روایت میں آتا ہے:

قال عمر رضی اللہ عنہ انا لاندخل کنائسکم من اجل التماثیل التی فیہا الصور (بخاری)

حضرت عمر نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمھارے عبادت خانوں میں اس لئے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں

تصویری مجسمے ہیں۔

۱۴ھ میں حضرت سعد بن وقاص کی سرکردگی میں مدائن فتح ہوا۔ مدائن قدیم ایرانی شہنشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔ یہیں ان کا مشہور قصر ابیض (سفید محل) تھا۔ آخری ایرانی حکمران یزدجرد جب محل چھوڑ کر بھاگا تو حضرت سعد بن وقاص مدائن کے فاتح کی حیثیت سے قصر ابیض میں داخل ہوئے۔ اس وقت آپ کی زبان پر سورہ دخان کی آیات ۲۵۔ ۲۸ تھیں۔

یہ جمعہ کا دن تھا۔ قصر ابیض میں جس جگہ شہنشاہ کا تخت ہوتا تھا وہاں منبر رکھا گیا آپ نے اس منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور جمعہ ادا کیا۔ یہ پہلا جمعہ تھا جو قدیم ایران کے دارالسلطنت میں ادا کیا گیا۔

فتح مدائن کے جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ شاہی محل میں جتنی بھی تصویریں اور مجسمے تھے سب بدستور باقی رکھے گئے۔ حضرت سعد بن وقاص نے نہ ان کو توڑا اور نہ ان کو وہاں سے جدا کیا۔ اس سلسلے میں یہاں تاریخ کے دو حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ثم انتهى الى ايوان كسرىٰ وصلى فيه صلوٰة الفتح ولا صلى جماعة فصلى ثمانية ركعات لا يفصل بينهن واتخذه مسجداً وفيه تماثيل الجص رجال وخيل ولم يمتنع ولا المسلمون لذالك وتركوها على حالها (تاريخ الطبرى، جلد۴) واتخذ سعد ايوان كسرىٰ مصلى ولم يغير ما فيه من التماثيل (الكامل فى التاريخ جلد ۲)

سعد بن ابی وقاص ایوان کسریٰ پہنچے۔ اور اس کے اندر فتح کی نماز پڑھی۔ اور جماعت نہیں کی۔ انھوں نے آٹھ رکعتیں پڑھیں، ان کے درمیان فصل نہیں کیا (ایک سلام سے آٹھ رکعتیں) اور اس کو مسجد بنایا حالانکہ اس میں انسان اور گھوڑے کے مجسمے موجود تھے۔ اور نہ سعد بن ابی وقاص نے اور نہ مسلمانوں نے اس سے تعرض کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اور سعد بن ابی وقاص نے کسریٰ کے ایوان کو مسجد بنایا اور اس میں جو مجسمے تھے ان میں کوئی تبدیلی نہ کی۔

صحابہ کرام نے جو کچھ کیا اس کی وجہ ان کا داعیانہ مزاج تھا۔ وہ اس قسم کے معاملات کو ہمیشہ دعوتی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا داعیانہ مزاج سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جو چیز ان کے سامنے لاتا تھا وہ غیر مسلم اقوام کو دعوت حق کا مخاطب بنانا تھا۔ بقیہ تمام چیزیں ان کی نظر میں ثانوی تھیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام میں اتنی زبردست فکری قوت ہے کہ غیر مسلم اقوام اس کے آگے مسخر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور جب قومیں مسخر ہو جائیں تو بقیہ تمام مقاصد اپنے آپ حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرک بھی مٹ جاتا ہے اور شرک کے تمام آثار اور علامات بھی۔

شکایات

ہندستان کی آزادی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ دیہات کے ایک آدمی شہر آئے اور اپنے ایک ملاقاتی کے یہاں مقیم ہوئے۔ ان کی ضیافت کے لئے گھر کے اندر سے خربوزہ بھیجا گیا۔ ایک بڑی پلیٹ میں خربوزہ کے ساتھ چھری رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے جب اس کو دیکھا تو سخت حیران ہوئے۔ انھوں نے کہا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خربوزہ اور چھری کا کیا جوڑ ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے خربوزہ کھائے بغیر اسے لوٹا دیا۔

بعد کو ایک شخص نے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خربوزہ کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سے دبا کر اس کو توڑا اور کھا گئے۔ پھر یہ چھری کس لئے۔ میں تو اسے ٹونا ٹوٹکا سمجھا، اس لئے میں نے اسے نہیں کھایا۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مذکورہ شخص کے ساتھ رات کو پیش آیا۔ رات کو جب ان کے سونے کے لئے بستر بچھایا گیا تو ان کے بستر پر ایک تکیہ بھی تھا۔ وہ رات بھر تکیہ کو دیکھتے رہے اور سو نہ سکے۔ بعد کو اس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ میں تو یہی سمجھا کہ اس کے اندر مال ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس "گٹھری" کی رکھوالی کروں یا سوؤں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے کے بارے میں شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کے خلاف سخت برہم ہو جاتا ہے۔ اپنے طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکایت اور برہمی بالکل بجا ہے۔ حالانکہ اس کی وجہ صرف اس کا ناقص علم ہوتا ہے۔ پوری صورت حال سے بے خبری کی بنا پر وہ بطور خود ایک رائے قائم کر لیتا ہے اور اس پر شدت سے قائم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اصل واقعہ کے اعتبار سے اس کی شکایت کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

اس برائی سے بچنے کی ترکیب قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ جب بھی کوئی بات سنو تو اس کی تحقیق کر لو۔ اگر آدمی واقعۃً سنجیدہ ہو تو وہ دو میں سے کوئی ایک رویہ اختیار کرے گا۔ یا تو سنی ہوئی بات کو بھلا دے گا اور اس کا کوئی چرچا نہیں کرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ اس کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ متعلقہ شخص سے اس کی تحقیق کرے گا۔ اور تحقیق کے بعد جو بات سامنے آئے گی اس کو مان لے گا۔ تحقیق کے بغیر شکایتوں کا چرچا کرنا جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط یہ بھی ہے کہ تحقیق کے بعد بھی آدمی اپنی رائے پر قائم رہے۔ متعلقہ شخص کی تردید کے باوجود وہ اس کو مسلسل دہراتا رہے۔

تنقید

برطانیہ میں جون ۱۹۸۳ میں جنرل الکشن ہوا۔ اس الکشن میں کنسر ویٹو پارٹی کامیاب ہوئی اور اس کی لیڈر کی حیثیت سے مسز مارگریٹ تھیچر دوبارہ برطانیہ کی وزیراعظم مقرر ہوئیں۔ اس کامیابی کے بعد مسز تھیچر نے پہلا کام یہ کیا کہ مسٹر فرانسس پم (Francis Pym) کو حکومت سے علیحدہ کر دیا۔ مسٹر پم مسز تھیچر کی اپنی پارٹی کے لیڈر تھے اور مسز تھیچر کی کیبنٹ میں وزیر خارجہ کے عہدہ پر تھے۔

مسٹر پم ایک بہت اونچے خاندان کے فرد ہیں۔ ان کو حکومت میں اعلیٰ مناصب حاصل رہے ہیں۔ پھر مسز تھیچر نے کیوں ان کو کابینہ سے علیحدہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الکشن کے زمانہ میں ایک تقریر میں مسٹر پم نے ایک ایسی بات کہہ دی جو مسز تھیچر کو پسند نہیں آئی۔

مسٹر پم نے ایک انتخابی تقریر میں حزب اختلاف (اپوزیشن) کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ کوئی بھی حکومت معیاری حکومت نہیں ہوتی۔ اس لئے اچھی حکومت قائم کرنے کے لئے مضبوط حزب اختلاف لازمی طور پر ضروری ہے جو اس کی اصلاح کرتی رہے:

A strong opposition is an indispensable ingredient of good government. (Because) no government is perfect.

مسٹر پم کا یہ بیان مسز تھیچر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ انھوں نے فوراً مسٹر پم کو وزارت سے خارج کر دیا۔

انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ اس کمزوری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اچھے ساتھیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

کوئی اعلیٰ کام اعلیٰ قابلیت کے ساتھیوں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور اعلیٰ قابلیت کے ساتھیوں کو جوڑنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ان کی تنقیدوں کو برداشت کیا جائے۔ کیوں کہ اعلیٰ ذہن کے لوگ اپنی ذہنی آزادی کو مقید کر کے نہیں رہ سکتے۔ اب اگر سربراہ وسیع ظرف کا آدمی ہے تو وہ اپنے ساتھیوں کی فکری آزادی اور ان کے اختلاف کو برا نہیں مانے گا۔ اس طرح وہ ایسے تمام لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑے رہے گا۔ اس کے برعکس اگر سربراہ تنگ ذہن کا آدمی ہے تو وہ ایسے لوگوں کی قدر نہ کر سکے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی جماعت تیسرے درجہ کے لوگوں کی ٹولی بن کر رہ جائے گی جو نہ کسی اعلیٰ کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ اس کو سمجھنے کی۔

کیسی عجیب محرومی

آپ کسی شخص کو ایک ڈالر دیں اور اس سے کہیں کہ آگے اسی قسم کے ایک کرور سکے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تم تیزی سے جاؤ تو اس پورے ذخیرہ کو حاصل کرسکتے ہو۔ ایسا آدمی ڈالر دیکھ کر کیا کرے گا۔ وہ ایک کو بھول کر ایک کرور کی طرف دوڑ پڑے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ موجودہ دنیا آخرت کا تعارف ہے۔ یہاں آدمی ان نعمتوں اور لذتوں کی ابتدائی پہچان حاصل کرتا ہے جس کو خدا نے کامل طور پر آخرت میں مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی جزء سے کل کو سمجھے۔ وہ قطرہ کو دیکھ کر سمندر کا اندازہ کرے۔

اگر آدمی کو دنیا کی صحیح معرفت حاصل ہو تو اس کے لئے دنیا مذکورہ ایک ڈالر کی مانند ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی لذت کو چھوڑ کر بڑی لذت کی طرف بھاگے گا۔ وہ دنیا کو بھول کر آخرت کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھے وہ موجودہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ وہ آخرت کو بھول کر اسی دنیا کی چیزوں میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔

سورج اس لئے ہے کہ وہ آخرت کی روشنیوں سے بھری زندگی سے انسان کو متعارف کرے۔ مگر انسان سورج کو دیکھ کر یہ کرتا ہے کہ وہ خود سورج ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ پھولوں اور درختوں کا حسن اس لئے ہے کہ وہ آدمی کو آخرت کے حسن کی یاد دلائے۔ مگر انسان پھولوں اور درختوں کو آخری چیز سمجھ کر انھیں کے درمیان اپنی مستقل جنت بنانے لگتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس لئے ہیں کہ انسان کو ہمہ تن آخرت کا مشتاق بنا دیں مگر انسان انھیں لذتوں میں ایسا کھوتا ہے کہ اس کو آخرت کی یاد بھی نہیں آتی۔

جو شخص موجودہ دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے اس نے اپنی آخرت کو کھو دیا۔ ایسا شخص آخرت میں پہنچے گا تو وہاں کی ابدی نعمتوں کو دیکھ کر اس کا یہ حال ہوگا گویا اس کا سینہ حسرت و یاس کا قبرستان بن چکا ہے۔ وہ کہے گا کہ میں بھی کیسا نادان تھا۔ میں نے جھوٹے عیش کی خاطر حقیقی عیش کو کھو دیا۔ میں نے جھوٹی لذت کے پیچھے حقیقی لذت گنوادی۔ میں نے جھوٹی آزادی سے فریب کھا کر اپنے آپ کو حقیقی آزادی سے محروم کر لیا۔

دنیا کی حقیقت

مسٹر آر۔ این پانڈے (۲۵ سال) ہندستانی فوج میں سکنڈ لفٹننٹ تھے۔ وہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۳ کو جموں توی اکسپریس پر سوار ہوئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں۔ انھیں دراصل آنکل اکسپریس پر سوار ہونا چاہئے تھا۔ جب اوکھلا کا اسٹیشن آیا تو وہ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے۔ ٹرین اس وقت پوری رفتار میں تھی۔ وہ پہیہ کے نیچے آگئے اور اسی وقت کٹ کر مر گئے (ہندستان ٹائمس ۱۳ نومبر ۱۹۸۳)

یہ واقعہ موجودہ دنیا میں انسان کی بے بسی کی ایک تصویر ہے۔ انسان ٹرین بناتا جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو لے کر دوڑتی ہے اور منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر اسی ٹرین کے مقابلہ میں انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کے پہیہ کے نیچے آنے کے بعد وہ اسی کی زد سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

ایک کامیاب انسان ہے۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتا ہے جو اس کی خوش حال زندگی کی علامت ہے۔ اس کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوتی ہے جو اس کی شان میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک کارخانہ کا مالک ہے جو اس کی دولت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بے شمار ساتھی ہیں جو اس کی قوت وشوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آدمی کی دنیوی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں سمٹ کر اوپر سے آدمی کے سر پر گرائی جائیں تو وہ اس کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ گویا ایک بہت بڑا ملبہ ہوگا جو آدمی کے اوپر پٹک دیا گیا اور اس کے نیچے دب کر اس کا وجود فنا ہو گیا۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیوی ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا کی تمام ترقیاں اسی وقت تک ترقیاں نظر آتی ہیں جب تک وہ فریب کے روپ میں ہوں۔ جیسے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آئیں وہ صرف بربادی کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ یہ ترقیاں اپنے آخری انجام کے اعتبار سے کسی کے لئے قبرستان تو بن سکتی ہیں مگر وہ کسی کے لئے کامیابی کا شاندار محل نہیں بن سکتیں۔

لذتیں جنت میں لذت ہیں اور دنیا میں صرف فریب لذت۔ انسان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو وہ موجودہ دنیا ہی میں پانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے آدمی یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

خدائی کارخانہ

سورج گویا قدرت کا ایک کارخانہ ہے جو مادہ کو روشنی میں تبدیل کرتا ہے۔ گائے ایک زندہ کارخانہ ہے جس میں گھاس داخل ہوتی ہے اور گوشت اور دودھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح درخت قدرت کا ایک کارخانہ ہے جس میں مٹی اور پانی اور گیس داخل ہوتے ہیں اور وہ پھول اور پھل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

یہ عمل جو سورج اور درخت اور جانور میں کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے، یہی عمل انسان سے بھی اس کے خالق کو مطلوب ہے۔ فرق یہ ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں میں تبدیلی کا عمل قانون قدرت کے تحت مجبورانہ طور پر انجام پاتا ہے۔ اور انسان میں تبدیلی کا یہ عمل خود انسان کے اپنے ارادہ کے تحت اختیارانہ طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ دوسری چیزوں میں تبدیلی مادی اعتبار سے ہو رہی ہے اور انسان کے اندر خدائی اعتبار سے۔

انسان سے اس کے پیدا کرنے والے کو یہ مطلوب ہے کہ وہ خارجی دنیا کے مشاہدات کو دلائل خداوندی میں تبدیل کرے۔ جو چیز اس کے اندر صرف بطور "معلومات" داخل ہوئی تھی اس کو اپنے ذہن میں "معرفت" کی صورت دے سکے۔ اس کو جب دنیا میں کوئی کامیابی حاصل ہو تو اس کو وہ تمام تر خدا کے خانہ میں ڈال دے۔ اس کو جب کوئی ناکامی ہو تو اس کے ذریعہ وہ عجز انسانی کی حقیقت کو دریافت کرے۔ اس کو جب کسی سے شکایت ہو تو اس کا اندرونی نظام اس کو معافی اور درگذر کی صورت میں تبدیل کر دے۔ وغیرہ

جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل کرے اس کو زرخیز زمین کہا جاتا ہے۔ اور جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل نہ کر سکے وہ بنجر زمین کہی جاتی ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ جو انسان اپنے اندرونی نظام کو اس طرح بیدار کرے کہ وہ خام چیزوں کو اعلیٰ چیزوں میں تبدیل کرنے لگے وہ مومن ہے اور جس انسان کا اندرونی کارخانہ ایسا کرنے میں ناکام رہے وہ کافر ہے۔

زرخیز زمین اور بنجر زمین میں جو فرق ہے وہی فرق مومن اور غیر مومن کے درمیان پایا جاتا ہے۔ زرخیز زمین کے حصہ میں شادابی آتی ہے اور بنجر زمین صرف اجاڑ پڑی رہتی ہے۔ اسی طرح مومن انسان کے لئے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جنت ہے اور غیر مومن انسان کے لئے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جہنم۔

سرسبز درخت

درخت جب بلند ہو کر فضا میں اپنی شاخیں پھیلاتا ہے اور ایک ہرے بھرے وجود کی صورت میں زمین پر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ دیکھنے والوں کی نظر میں کتنا حسین ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک کامل وجود ہے۔ اس نے وہ سب کچھ پایا ہے جو اسے پانا تھا۔ اس نے کائنات میں اپنے لئے وہ جگہ حاصل کر لی ہے جو اسے درکار تھی۔

اس کے برعکس انسان کو دیکھئے تو انسان ایک محروم اور ناکام وجود نظر آتا ہے۔ یہاں پا سئے ہوئے لوگ بھی اندر سے خالی ہیں۔ کامیاب لوگ بھی مستقل طور پر ناکامی کے احساس سے دوچار ہیں۔ انسان اس کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ وہ دوسری تمام چیزوں سے برتر اوصاف اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا دوسری انواع سے پیچھے ہونا کس قدر عجیب ہے۔

ایک درخت کا دوسرے درخت سے کوئی ٹکراؤ نہیں، جب کہ ایک انسان دوسرے انسان سے لڑتا ہے۔ جس درخت سے جس پھل کی امید کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اپنی شاخ پر وہی پھل نکالتا ہے۔ جب کہ انسان کا حال یہ ہے کہ اس سے جو امید کی جائے اس پر وہ پورا نہیں اترتا۔ درخت اپنے دشمن کو بھی سایہ دیتا ہے اور اپنے دوست کو بھی۔ جب کہ انسان اپنے دوست کے لئے کچھ ثابت ہوتا ہے اور غیر دوست کے لئے کچھ۔

اس فرق کا کوئی پراسرار سبب نہیں۔ اس کا سبب دونوں کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ درخت اور دوسری چیزیں اپنے خالق کے نقشہ پر قائم ہیں۔ اس کے برعکس انسان اپنے خالق کے نقشہ پر قائم نہیں

یہ کائنات ایک مرکزی اور مجموعی نقشہ کے مطابق بنی ہے۔ یہاں امن و سکون اس مرکزی اور مجموعی نقشہ سے مطابقت کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کامیابی کائناتی منصوبہ سے ہم آہنگی کی قیمت ہے اور ناکامی اس سے ہم آہنگ نہ ہونے کی قیمت۔

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آتے ہیں وہ دراصل اسی خلا کو پر کرنے کے لئے آتے ہیں۔ پیغمبروں کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو کائنات کی مجموعی اسکیم سے ہم آہنگ کرے۔ وہ کس اسلوب حیات کو اختیار کرے کہ وہ بھی خدا کی دنیا میں ایک "ہرا بھرا درخت" بن کر کھڑا ہو سکے۔

چڑیا اور انسان

سالم علی (عمر ۸۷ سال) چڑیوں کے مطالعہ کے سب بڑے ماہر ہیں۔ ابھی وہ صرف دس سال کے تھے کہ انھیں چڑیوں کے مطالعہ سے دلچسپی ہوگئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس طرح گذارا ہے کہ ہاتھ میں دوربین ہے۔ ایک کندھے سے کیمرہ لٹک رہا ہے اور دوسرے کندھے میں ایک بیگ ہے جس میں ضروری سامان رکھے ہوئے ہیں اور وہ بستی سے باہر چڑیوں کے مشاہدہ اور مطالعہ میں معروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں جواہر لال نہرو سے بھی زیادہ سفر کئے۔ حتیٰ کہ لوگ انھیں چڑیا والا (Birdman) کہنے لگے۔ اس فن میں مہارت کی وجہ سے ان کو بہت سے ملکی اور غیر ملکی انعامات مل چکے ہیں۔

ہندستان میں دو ہزار سے زیادہ اقسام کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ سالم علی نے ان کا مطالعہ کرکے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام: *The Handbook of Indian Birds* ہے۔ یہ کتاب انھوں نے ۲۰ سال کے مطالعہ کے بعد لکھی۔

ایک اخبار کا نمائندہ بمبئی میں ان کے مکان پر ان سے ملا۔ اس نے سالم علی کو نہایت شریف اور مہذب انسان پایا۔ اس کا خیال ہے کہ سالم علی میں یہ غیر معمولی شرافت چڑیوں کے مطالعہ سے آئی ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۳) میں لکھا کہ انسان کو زیادہ انسانیت والا بنانے کے لئے غالباً یہ تجویز کیا جانا چاہئے کہ چڑیوں کے مطالعہ کو داخل نصاب کر دیا جائے:

Perhaps a course in bird-watching should be recommended to make men more human.

دنیا میں بے شمار قسم کی چڑیاں اور جانور پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ان کے بارہ میں بہت کم جانتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں زمین پر پائے جانے والے مختلف جانوروں کا وسیع مطالعہ کیا گیا ہے اور ان سے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں۔ جانوروں کے طرز زندگی سے انسان کو باخبر کرنے کے لئے آج کل مختلف ذریعے کئے گئے ہیں۔ جانوروں کے کھلے پارک اور چڑیا گھر قائم کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ اب بہت سی یونیورسٹیوں میں جنگلی جانوروں کی زندگی کے مضامین باقاعدہ نصاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ جانوروں میں انسان کے لئے بہترین نمونے موجود ہیں۔ ہر جانور نہایت صحیح فطری زندگی گذارتا ہے۔ جب کہ انسان بار بار فطرت کے راستہ سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان اگر جانوروں کی تقلید کرے تو یہی اس کی نجات کے لئے کافی ہو جائے۔

کتاب محفوظ

ایک کاتب صاحب کو ایک کتاب کا مسودہ کتابت کے لئے دیا گیا۔ اس مسودہ میں ایک جگہ محدث ابو دعاد کا نام تھا۔ کاتب صاحب ابو دعاد سے واقف نہ تھے۔ البتہ وہ ابو داؤد کو جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابو دعاد کی جگہ ابو داؤد لکھ دیا۔ اسی طرح ایک مضمون میں ایک جگہ ہیلی کاپٹر کا لفظ تھا۔ کاتب صاحب اس کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اصل لفظ کی جگہ اپلی کا پیڑ لکھ دیا۔

اس قسم کی غلطیوں کی مثالیں بہت عام ہیں۔ ایک آدمی کسی مضمون کو پڑھ رہا ہے یا اس کو نقل کر رہا ہے۔ اس درمیان میں ایک ایسا جملہ آتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ اس کو وہ اپنے ذہن کے مطابق بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو کسی ذاتی غرض کے تحت اصل متن میں بالقصد تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں ایسی باتیں شامل کر دیتے ہیں جو اصل کتاب میں اس کے مصنف نے شامل نہ کی تھیں۔

پچھلی آسمانی کتابوں میں جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی وجہ انسان کی یہی کمزوری ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو سات دنوں (ایام) میں پیدا کیا۔ یہی بات بائبل میں اس طرح ہے کہ ساتوں دن کی الگ الگ تفصیل ہے۔ ہر دن کی تخلیقات کا ذکر کرنے کے بعد اس میں یہ فقرہ ملتا ہے "اور شام ہوئی اور صبح ہوئی" یہ فقرہ یقینی طور پر مذکورہ بالا ذہن کے تحت انسان کا اضافہ ہے۔ کسی بزرگ نے بطور خود بائبل کے جملہ کو مکمل کرنے کے لئے یہ الفاظ بڑھا دیئے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ گنجائش ہے کہ دن کو دور (Period) کے معنی میں لے سکیں۔ مگر بائبل میں مذکورہ فقرہ کے اضافہ نے اس کو دَور کے معنی میں لینا ناممکن بنا دیا۔

بائبل میں اس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مثالیں نہایت بھونڈی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اپنا ہاتھ نکالیں تو وہ چمکنے لگے۔ مگر بائبل میں اس کا ذکر ہے تو وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔ اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا (خروج ۴:۶) بائبل کے اس فقرہ میں "کوڑھ سے" یقینی طور پر بعد کے لوگوں کا تشریحی اضافہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے مطابق حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا چمکنا خدائی سبب سے معلوم ہوتا ہے اور بائبل کے الفاظ کے مطابق مرض کے سبب سے۔

قرآن تمام آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان کتابوں کے حامل انسانوں پر ڈالی گئی تھی۔ اسی لئے قرآن میں ان کے لئے استحفاظ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی حفاظت چاہنا (بما استحفظوا من کتاب اللہ) اس کے برعکس قرآن کے بارہ میں حافظ کا لفظ آیا ہے یعنی حفاظت کرنے والا (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون)

قرآن میں ایسے بہت سے مواقع تھے جہاں حاملین قرآن کے لئے گنجائش تھی کہ وہ اس میں مذکورہ بالا قسم کی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے عملاً ایسا کیا بھی مگر انھوں نے جو کچھ کیا وہ "حاشیہ" کی حد تک محدود رہا۔ "متن" میں وہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ حاشیہ اور تفسیر میں چونکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ تھے، اس لئے اس میں انھوں نے طرح طرح کی معصومانہ تبدیلیاں کر دیں۔ مگر جہاں تک متن کا تعلق ہے، اس کو خدا نے براہ راست اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا، اس لئے یہاں وہ کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے سے قاصر رہے۔

اس موقع پر وضاحت کے لئے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ قرآن کی پہلی نزولی آیت ہے: اقرأ باسم ربك الذی خلق (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) اسی طرح دوسرے مقام پر ہے سنقرئك فلا تنسی (ہم تجھ کو پڑھا دیں گے پھر تو نہ بھولے گا) ان آیات میں اقرأ اور سنقرأ کے الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی کتاب یا کوئی لکھی ہوئی چیز رکھی گئی اور کہا گیا کہ اس کو پڑھو۔

یہ بات مسلمانوں کے عام عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ امی تھے۔ گویا آیت کے یہ الفاظ اپنے ظاہر کے اعتبار سے مسلمانوں کے عقیدہ میں مانع ہیں اور مخالفین اسلام کو غیر ضروری طور پر یہ کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم امی نہیں تھے بلکہ پڑھے لکھے تھے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ دوسری کتابوں کے متن کی طرح مسلمان قرآن کے ان الفاظ کو بدل دیں۔ یہ قرآن کے محفوظ کتاب ہونے کا ایک واضح داخلی ثبوت ہے۔ ورنہ اگر دوسری کتابوں کی طرح کا معاملہ ہوتا تو قرآن میں ہم کو اقرأ کی جگہ اُتْلُ یا تَنَسَّطْ لکھا ہوا ملتا۔ اسی طرح لکھنے والوں نے سنقرئك کے بجائے سنحفظك لکھ دیا ہوتا۔

اسی طرح ایک مثال سورہ قیامۃ کی ایک آیت وقیل من راق (اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک والا) ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان جب اس آیت کو پڑھتے ہیں تو وہ مَنْ پر وقف کرتے ہیں۔ یعنی مَنْ کے بعد کسی قدر رک کر راق کہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سننے والے اصحاب نے بیان کیا کہ آپ نے جب یہ آیت پڑھی تو آپ نے حرف مَن پر وقفہ کیا۔ ورنہ نحو وصرف کے فن کے اعتبار سے اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے کہ یہاں یہ وقفہ کیوں کیا جائے۔ اگر قرآن کے ساتھ اس کے حاملین وہ معاملہ کرسکتے جو دوسری کتابوں کے ساتھ اس کے حاملین نے کیا تو لازماً ایسا ہوتا کہ یہ وقفہ باقی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں مسلمان اس کو وقیل من راق پڑھتے نہ کہ وقیل من (سکتہ) راق۔

اسی طرح قرآن میں ہے: یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء (اے نبی جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو) یہ جملہ نحو وصرف کے عام قاعدہ کے خلاف ہے۔ اس میں واحد سے خطاب کرکے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ عام لکھنے اور بولنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اگر قرآن کا وہ معاملہ ہوتا جو دوسری آسمانی کتابوں کا ہے تو یقینی طور پر ایسا ہوتا کہ کچھ مسلمان اس آیت کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ چکے ہوتے:

یا ایہا النبی اذا طلقت النساء، یا یا ایہا الرسل اذا طلقتم النسآء۔

یہی معاملہ طرز تحریر کا ہے۔ عربی فن خطاطی نے بعد کے زمانہ میں بہت ترقی کی۔ جبکہ قرآن اس وقت لکھا گیا جب کہ فن خطاطی نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ قرآن کے طرز کتابت میں اور عام خطاطوں کے طرز کتابت میں بہت سے مقامات پر فرق ہے۔ مثلاً قرآن میں مالك کو مٰلك لکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس طرز کتابت کی وجہ سے آیت کے دو تلفظ بن گئے ہیں۔ کوئی اس کو مالِك یوم الدین پڑھتا ہے اور کوئی اس کو مَلِك یوم الدین پڑھتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوا کہ آیت کا املاء بدل کر اس کو مالك یوم الدین بنادے۔

قرآن کے حاشیہ میں بعد کے لوگوں نے جو تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: انی جاعل فی الارض خلیفة (میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) بعد کے متعدد مفسرین نے اس آیت میں خلیفہ کے لفظ کو خلیفة اللہ کے ہم معنی بنادیا اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ —— خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ حالانکہ "اپنا" کا لفظ یہاں سراسر اضافہ ہے۔ ان حضرات نے حاشیہ میں تو اس قسم کے اضافے خوب کئے مگر متن میں اضافہ کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہوسکا۔ اگر قرآن کے متن پر خدا کا پہرہ نہ ہوتا تو غالباً وہ آیت کے الفاظ کو ناکافی سمجھ کر اس کو اس طرح لکھ دیتے:

انی جاعل فی الارض خلیفتی یا انی جاعل فی الارض خلیفة منی

دوسری آسمانی کتابوں میں سے ہر کتاب میں یہ ہوا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے اپنے

طور پر جو کچھ چاہتے تھے وہ سب انھوں نے خدا کی کتاب میں کہیں نہ کہیں داخل کر دیا۔ مثال کے طور پر یوحنا کی موجودہ انجیل میں ہم کو یہ فقرہ ملتا ہے:

"دوسرے دن اس نے یسوع کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا، دیکھو یہ خدا کا برہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے جو مجھ سے مقدم ٹھہرا ہے کیونکہ وہ مجھ سے پہلے تھا" (یوحنا باب ۱)

انجیل یوحنا کا یہ فقرہ حضرت یحییٰ کی زبان سے حضرت مسیح کے بارہ میں ہے۔ حضرت یحییٰ کی یہ تقریر بقیہ تینوں انجیلوں میں بھی ہے مگر ان میں "جو دنیا کا گناہ اٹھالے جاتا ہے" موجود نہیں۔ یہ الفاظ یقینی طور پر بعد کو اصل تقریر میں اس لئے بڑھائے گئے تاکہ ان سے کفارہ کا عقیدہ نکالا جاسکے۔ بعد کے مسیحیوں کا پسندیدہ عقیدہ (کفارہ) کو انجیل سے ثابت کرنے کے لئے حضرت یحییٰ کی مذکورہ تقریر میں یہ جملہ بڑھا دیا گیا۔

یہی بات قرآن میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے انتہائی محبوب عقیدے بھی قرآن کے متن کے اندر موجود نہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا اور خدا کے یہاں آپ کا شفیع المذنبین ہونا مسلمانوں کے محبوب ترین عقائد ہیں۔ مگر قرآن میں کسی مقام پر وہ واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔ مسلمان یہ تو کر سکے کہ اپنے ان عقائد کو بعض آیات سے بطریق استنباط نکالیں۔ مگر وہ ان کو متن قرآن میں داخل نہ کر سکے۔ اگر مسلمانوں کو متن میں تصرف کی قدرت حاصل ہوتی تو یقیناً آج ہم قرآن میں کوئی ایسی آیت پڑھتے جس کے الفاظ یہ ہوتے:

یا محمد انت افضل الانبیاء وانت شفیع المذنبین یوم القیامۃ

یہ چند سادہ قسم کی داخلی مثالیں ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن آج بھی اسی ابتدائی حالت میں موجود ہے جس حالت میں اس کے پیغمبر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے زمانہ میں لکھوایا تھا۔ اس میں کسی قسم کا معمولی تغیر بھی نہ ہو سکا۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن جب واحد آسمانی کتاب ہے جس کا متن پوری طرح محفوظ ہے تو اسی کا حق ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے لئے واحد رہنما کتاب بنے جو وحی الٰہی کو مانتے ہیں اور خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ محفوظ اور غیر محفوظ دونوں قسم کی کتابوں کی موجودگی میں یقینی طور پر محفوظ کتاب کی پیروی کی جائے گی۔ نہ کہ غیر محفوظ اور تبدیل شدہ کتاب کی۔

بامقصد زندگی

انسان کا اعلیٰ ترین شرف کیا ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ ہے "بامقصد زندگی"۔ بامقصد زندگی انسانی ترقی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی بھی ایسا کام جس میں بظاہر کوئی غرض شامل ہو اس کو اختیار کرنے سے زندگی بامقصد ہو جائے گی۔ نہیں۔ بلکہ وہی زندگی حقیقۃً بامقصد زندگی ہے جس میں انسان اپنی اعلیٰ ترین حیثیت کو پالے، جس میں اسکی شخصیت اپنے امتیازی وصف کے ساتھ ظہور کر سکے۔

ایک جانور اپنی غذا کے لئے دوڑ رہا ہے، ایک چڑیا موسم کی تبدیلی کے وقت کسی دوسرے بہتر علاقے کی تلاش میں اڑان کر رہی ہے، ایک بھڑ مٹی کے گارے سے اپنا مکان بنانے میں مصروف ہے، ہرن کا ایک غول جنگل کے درندوں سے بچاؤ کے لئے تدبیر اختیار کر رہا ہے ــــ بظاہر یہ سب بامقصد عمل کی صورتیں ہیں، مگر بامقصد زندگی کا لفظ جب انسان کے لئے بولا جائے تو اس سے مراد اس قسم کی کوئی سرگرمی نہیں ہوتی۔ بلاشبہہ انسان کو دنیا میں جو کچھ کرنا ہے اس میں سے ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لئے کھانا، کپڑا، مکان اور دوسری ضروریات کا انتظام کرے، مگر یہ مقصدیت کی وہ سطح ہے جہاں انسان اور حیوان دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ جبکہ انسان کے اعتبار سے بامقصد زندگی صحیح معنوں میں وہ ہوگی جہاں وہ اپنے حقیقی شرف کے ساتھ نظر آرہا ہو۔ جب وہ مشترک حیوانیت آگے بڑھ کر ممتاز انسانیت کی شکل اختیار کر لے۔

دنیا میں دو طرح کی چیزیں ہیں ـ جاندار اور بے جان۔ ظاہر ہے کہ جاندار چیزوں کو بے جان اشیاء پر ایک برتری حاصل ہے۔ اب جاندار چیزوں کو دیکھئے تو ان کی تین قسمیں ملیں گی۔ نباتات، حیوانات اور انسان۔ جدید سائنس دانوں نے تحقیق سے معلوم کیا ہے کہ نباتات بھی ذی حیات اشیاء ہیں، ان کے اندر نمو، حرکت، تغذیہ، احساس اور اس طرح کی دوسری چیزیں پائی جاتی ہیں جو صرف ذی حیات اشیاء کی خصوصیات ہیں۔

مگر حیات کا زیادہ اعلیٰ نمونہ حیوانات اور انسان ہیں۔ انسان کو حیوانات پر کس پہلو سے تفوق حاصل ہے، اس کا جواب عرصہ سے دیا جاتا رہا ہے۔ اور بڑے بڑے اذہان اس پر کام کرتے رہے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے علمائے حیاتیات کا ذہن جہاں آکر ٹھہرا ہے وہ

یہ کہ انسان کی ما بہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ تصوری فکر (Conceptual Thought) کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب کہ دیگر حیوانات اس سے محروم ہیں۔ انسان جب سوچتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اپنے عمل کا شعوری طور پر اپنے ذہن میں نقشہ بناتا ہے۔ وہ ارادی فکر کے ساتھ کام کرتا ہے، جب کہ دیگر حیوانات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ بظاہر وہ بھی بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے۔ مگر ان کا عمل سوچے سمجھے فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ محض جبلت کے تحت ہوتا ہے۔ ان کی خواہشیں زور کرتی ہیں۔ ان کی ضروریات ان سے تقاضا کرتی ہیں، ان کی طبیعت انہیں اکساتی ہے۔ اور اس طرح خارجی اثرات اور اندرونی دباؤ کے تحت وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے۔

انسان کی اسی امتیازی خصوصیت میں اس بات کا جواب ہے کہ وہ کون سا کام ہے جو انسان کا اعلیٰ ترین مقصد قرار پا سکتا ہے۔ یہ مقصد وہی ہو سکتا ہے جو خواہشات کے دباؤ یا فوری ضروریات کے تقاضے کے تحت نہ بنا ہو بلکہ وہ سوچی سمجھی ہوئی ایک راہ ہو جس میں انسان کے امتیازی وصف کی شان پائی جائے، جس میں انسانی شخصیت کا اعلیٰ ترین پہلو جگمگا رہا ہو۔ جس میں انسان اپنی بلند ترین حیثیت میں پوری طرح نمایاں ہو گیا ہو۔

یہاں پہنچ کر جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو وہاں اس سلسلے میں ہم کو واضح رہنمائی ملتی ہے۔ قرآن میں انسانی زندگی کا مقصد ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:

وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون	اور میں نے جن اور انسان صرف اس لئے بنائے
ماارید منھم من رزق وماارید ان یطعمون	ہیں کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے رزق
ان اللہ ھوالرزاق ذوالقوۃ المتین ٥	نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا کہ وہ مجھ کو کھلائیں
ذاریات ــــ آخر	اللہ ہی روزی دینے والا اور زور آور مضبوط ہے۔

ان آیات میں انسانی زندگی کا مقصد خدا کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ یہ مقصد ایسا ہے جس میں انسان کا امتیاز اپنی آخری شکل میں ظہور کرتا ہے۔ یہ مقصد انسان کو حیوانی سطح سے اتنا اوپر لے جاتا ہے کہ حیوانی زندگی کی کوئی آلائش اس کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ آیت میں کہا گیا ہے کہ خدا تم سے اپنے لئے روزی نہیں مانگتا۔ بلکہ وہ خود تمہاری روزی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی عبادت زندگی کا ایسا مقصد ہے جو محض اندرونی خواہشات کے زور یا خارجی اثرات کے دباؤ سے نہیں بن جاتا۔ بلکہ وہ خالص فکر کے تحت وجود میں آتا ہے۔ آدمی اپنی ذات اور اپنے

ماحول سے بلند ہو کر سوچتا ہے جبھی وہ سمجھ سکتا ہے کہ کوئی بالاتر مقصد ہے جس کو اسے اپنی زندگی کا مرکز و محور بنانا چاہئے۔

اس مقصد کے لئے متحرک کرنے والی چیز یہ نہیں ہے کہ اپنی یا دوسرے کی مادی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ اس میں نہ عابد کی اپنی خواہشات کی تکمیل رہنما ہوتی ہے اور نہ معبود کی خواہشات کی تکمیل۔ بلکہ یہ مقصد ان سب سے بلند تر ایک نشانہ آدمی کو دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا نشانہ ہے جو نہ اندرونی تقاضے کے تحت وجود میں آتا اور نہ بیرونی دباؤ کے تحت۔ بلکہ وہ خالصتہً تصوری فکر کے تحت بنتا ہے۔

جب ایک شخص کاروبار کرتا ہے، روپیہ کماتا ہے، مکان تعمیر کرتا ہے، معیارِ زندگی بڑھانے میں اپنی قوتیں لگا دیتا ہے، عمدہ سواری، عمدہ مکان، عمدہ فرنیچر، عمدہ لباس، عمدہ دسترخوان کا اہتمام کرتا ہے تو بظاہر وہ ایک مقصد میں لگا ہوا ہے مگر ایسی زندگی کو بامقصد زندگی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انسان کی امتیازی حیثیت اس طرح کے کسی مقصد میں پوری طرح نمایاں نہیں ہوتی۔ بظاہر اس طرح کی زندگی میں بھی آپ کا ارادی فکر کام کرتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس راہ میں جس چیز نے آپ کو ڈالا ہے وہ اپنے آخری تجزیے میں وہی داعیہ ہے جو ایک حیوان کو مختلف شکلوں میں متحرک کرتا ہے۔ یعنی خواہشات کا زور، ضروریات کا دباؤ، اندرونی تقاضوں کی تکمیل کا احساس۔ حقیقتہً اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو آپ کی معاشی زندگی میں آپ کی رہنمائی کر رہی ہو۔

آدمی جب شعور حاصل کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی کچھ مادی ضرورتیں ہیں جن کو حاصل کئے بغیر وہ زندگی نہیں گزار سکتا، اسے کھانے کی، کپڑے کی، مکان کی ضرورت ہے اسے ایسے قابلِ اعتماد ذریعۂ معاش کی ضرورت ہے جس سے آخر وقت تک وہ گزر سکے یہ چیز نظری طور پر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو حاصل کرے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں جس کے پاس افراط کے ساتھ ہوتی ہیں اس کی عزت ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کی خوشیوں اور لذتوں کو حاصل کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کی بات بلا دلیل مان لی جاتی ہے، کوٹھی اور موٹر اور بینک بیلنس اس کو وہ سب کچھ دیدیتے ہیں جس کی کوئی شخص اس دنیا میں تمنا کر سکتا ہے، یہ حالات اور یہ مشاہدہ اسے اکساتا ہے کہ وہ صرف ضروری معاش کے حصول پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر کرے۔

بازاروں کی چہل پہل ، دفتروں کی شان وشوکت اور بلڈنگوں کے پرکشش مناظر جن میں ہم انسان کو سرگرم دیکھتے ہیں ، حقیقتہً وہاں ان کے سوچے سمجھے فکر نے ان کی رہنمائی نہیں کی ہے۔ بلکہ ان کی ضرورتیں ان کی خواہشیں ان کی امنگیں اور دنیا میں باعزت اور سربلند جگہ حاصل کرنے کے بارہ میں ان کے حوصلوں نے ان کی رہنمائی کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کو وہ مقصد نہیں قرار دیا جا سکتا جو انسانی شرف کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔

انسان کا اعلیٰ ترین شرف کوئی ایسا مقصد ہی ہو سکتا ہے جو حقیقتہً خالص غور و فکر کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہو۔ جو اندرونی خواہشوں اور ماحول کے دباؤ کے نتیجہ میں وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ یہ مقصد "خدا کی رضاجوئی" کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی خدا کی رضا کو اپنا مقصد بناتا ہے تو یہاں اس کے انسانی اوصاف پوری طرح جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ ان تمام چیزوں سے بلند تر ایک مقصد ہے ، جس میں کوئی حیوان مصروف ہے۔ اس مقصد کو اختیار کر کے انسان فی الواقع تمام حیوانات سے مختلف ہو جاتا ہے ، یہ انسانی شرف کی آخری انتہا ہے۔

زندگی کا مقصد ، ایک لفظ میں ، زندگی کو بامعنی بنانے کی کوشش ہے۔ زندگی کو بامعنی بنانے کا منصوبہ ہمیشہ اس فرد کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے جس کی زندگی کو بامعنی بنانا مطلوب ہے۔ مثلاً بھیڑوں اور بکریوں کے گلہ کو بامعنی بنانا ہو ، یا گایوں اور بھینسوں کو بامعنی بنانے کا سوال ہو تو اس کا منصوبہ حیوانی سطح پر بنے گا۔ جیسا کہ ہم عام طور پر اس قسم کے منصوبوں میں دیکھتے ہیں۔

مگر انسان کا مقصد متعین کرنا ، بالفاظ دیگر ، انسان کی ہستی کو بامعنی بنانا ایک انسانی منصوبہ ہے نہ کہ حیوانی منصوبہ۔ ایسے منصوبہ کو یقینی طور پر ایسا ہونا چاہئے جو انسان کی امتیازی حیثیت کے عین مطابق ہو۔ جو انسان کو اس کی اصل خصوصیت کے اعتبار سے ترقی اور کامیابی کے مقام کی طرف لے جانے والا ہو۔

خدا کا عابد بننا اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف کرنا ہے ، اور اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف ہی انسان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

خدا پکار رہا ہے

درخت کیا ہے۔ درخت خدا کا ایک جادو ہے ۔ وہ ایک معجزاتی واقعہ ہے جو خدا اپنی خصوصی قدرت سے زمین پر ظاہر کرتا ہے۔ درخت اس بات کا اعلان ہے کہ کوئی ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اس کے لئے زندگی اور ہریالی کا ایک نیا امکان کھول دے، کوئی ہے جو خدا کے ساتھ ایک امید قائم کرے تاکہ خدا اس کی امید کو اس کے قیاس وگمان سے بھی زیادہ بڑی مقدار میں اس کے حق میں پورا کر دے۔

جب برسات کا موسم آتا ہے اور پانی سے لدے ہوئے بادل آسمان میں تیرنا شروع کرتے ہیں۔ بجلی کی کڑک چمک فضاؤں میں ایک تبدیلی کا اعلان کرتی ہے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے بارش کا پیغام لے کر ہر طرف دوڑنے لگتے ہیں تو یہ سب دراصل خدا کے ایک مطلوب کا اظہار ہوتا ہے، یہ مطلوب کہ خدا اپنی زمین میں کچھ ہرے بھرے درخت اگانا چاہتا ہے۔ اس وقت جو کسان خدا کے اعلان کو سمجھ لے اور ایک بیج لے کر زمین میں ڈال دے تو اس کے فوراً بعد خدا کا جادو ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں خالی زمین تھی وہاں معجزاتی طور پر ایک سرسبز وشاداب کائنات نکل کر کھڑی ہو جاتی ہے جس کے سائے کے نیچے لوگ پناہ لیں۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں ۔ جو لوگوں کے لئے رنگت اور خوشبو اور لذت کا ایک عظیم خدائی دستر خوان بن جائے ۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین اور دعوت دین کا ہے ۔ آج کی دنیا کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی آخری حد کو پہنچ چکی ہے ـــــ خدا کا نام لوگوں کے لئے ذاتی کاروبار کا

عنوان بن چکا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کو صرف فساد اور بگاڑ کے لئے استعمال کیا جار ہا ہے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتیں لوگوں کے لئے لوٹ کا میدان بنی ہوئی ہیں۔ خدا کی دنیا میں انسان نے خود اپنے آپ کو خدائی کے مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ظلم اور فساد اتنا بڑھ چکا ہے کہ انسانی نسل پر دوبارہ وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو حضرت نوح نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے بارہ میں کہے تھے: انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا كفارا (نوح ۲۷)

بگاڑ کی یہ انتہا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کا فیصلہ ظاہر ہو۔ وہ وقت آگیا ہے کہ دوبارہ زمین پر ایک طوفان نوح برپا ہو، تاکہ تمام برے لوگ اس میں غرق کر دیئے جائیں اور تمام اچھے لوگ اس سے بچا کر اس آخری دنیا میں پہنچا دیئے جائیں جو خدا کی مطلوب دنیا ہوگی، مثالی اور ابدی دنیا۔

مگر طوفان نوح سے پہلے اعلان نوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے کچھ بندے اٹھیں اور اپنی صحیح ترین اور کامل ترین صورت میں حق کا اعلان کر دیں۔ خدائی موسم اب آخری طور پر آچکا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ کوئی کسان اپنا بیج لے کر زمین میں ڈال دے۔ جس دن یہ واقعہ ہوگا اسی دن خدا کا معجزاتی کرشمہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔ خدا کی نصرتیں اس بندہ کے اوپر آسمان کے دروازے پھاڑ کر ٹوٹ پڑیں گی تاکہ جو کچھ بندے کو کرنا ہے بندہ اسے انجام دیدے۔ اور تاکہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے خدا اس کو ظہور میں لے آئے۔

اعلان حق کا مطلب حق کو آخری حد تک مبرہن کر دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کل خدائی کی سطح پر کھولا جانے والا ہے اس کو آج بندگی کی سطح پر لوگوں کے لئے کھول دیا جائے۔ اس کے بعد وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اور وہ لوگ دوسری طرف ہو جاتے ہیں جنہوں نے حق کو نہیں پہچانا اور اپنے آپ کو اس کی سمت میں کھڑا نہیں کیا۔ جب یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو اس کے فوراً بعد خدا کا آخری فیصلہ آجاتا ہے۔ اس وقت لوگ دیکھ لیتے ہیں کہ پہلا گروہ جنت کے زینہ پر کھڑا ہوا تھا اور دوسرا گروہ جہنم کے زینہ پر۔ (۴ جون ۱۹۸۲)

منزل کی طرف

آج کے اس جلسے کا جو عنوان ہے وہ محض ایک عنوان نہیں ہے بلکہ یہ وقت کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ہم ایک ایسے مسئلے پر سوچنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ساری دنیا کو درپیش ہے اور جس پر ہر جگہ غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ پوری انسانیت کی طرف سے ایک سوال کیا گیا ہے اور ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

پچھلی چند صدیوں کی تاریخ مذہب کے خلاف انسان کی بغاوت کی تاریخ ہے۔ قدیم ترین زمانے سے مذہب کو یہ حیثیت حاصل تھی کہ وہ فکر و عمل کے ہر میدان میں انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی کے بعد جب انسان تمدنی اعتبار سے ایک نئے دور میں داخل ہوا تو اسی کے ساتھ اس نے چاہا کہ ہر اس چیز سے علیحدگی اختیار کر لے جس کا تعلق ماضی سے ہو۔ چنانچہ اس نے مذہب کے پرانے راستے کو چھوڑ کر نئے خود ساختہ راہوں پر اپنا سفر شروع کر دیا۔ گاڑی کی تبدیلی کے ساتھ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کی سمت بھی نئی ہونی چاہئے۔ لیکن پچھلے سو برس کے تجربے نے اس خیال کی غلطی واضح کر دی ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اس قسم کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ بری طرح ناکام ثابت ہوئیں۔ اور اب انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ جائے۔ انسانیت کا بھٹکا ہوا قافلہ دوبارہ اپنی صحیح منزل کی طرف واپس ہونے کے لئے بے چین ہے۔ مذہب جو ماضی میں انسان کا دستور العمل تھا وہ مستقبل میں پھر انسان کا دستور العمل بننے والا ہے۔[1]

قانون کی ناکامی

پچھلے سماج میں مذہب جو کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ صدیوں کے دوران میں مختلف بزرگوں کی تعلیم و تلقین کی وجہ سے کچھ خاص تصورات لوگوں کے ذہنوں میں رچ بس گئے تھے۔ اور ان کے خلاف سوچنا یا عمل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مذہب کی منسوخی کے بعد جب یہ گرفت

---

[1] ایسا نہیں ہے کہ اس دوران میں مذہب کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ زندگی کے دھارے کے نیچے وہ ہمیشہ باقی رہا اور آج بھی باقی ہے۔ البتہ زندگی کی سرگرمیوں میں پہلے جو مقام اسے حاصل تھا وہ بعد کو اسے حاصل نہیں رہا۔

ڈھیلی ہو گئی تو اس کی جگہ لینے کے لئے اصلاحی قسم کے قوانین وجود میں آئے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کی اطاعت گزاری کی جگہ قانون کی حکمرانی نے لے لی۔ قانون اس متعین ضابطے کو کہتے ہیں جس کو کسی سماج میں لازمی طور پر قابل تسلیم قرار دیا گیا ہو اور جس کی خلاف ورزی پر آدمی کو سزا دی جا سکتی ہو۔ اس قسم کے قوانین ہر ملک میں نہایت وسیع پیمانے پر بنائے گئے۔ اس طرح گویا زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ریاست کی طرف سے حکماً یہ بتایا گیا کہ وہ صحیح ترین رویہ کیا ہے جسے آدمی کو اختیار کرنا چاہیے۔ مگر ان قوانین کا فائدہ صرف یہ ہوا ہے کہ جو برائی پہلے سیدھے طریقے سے ہوتی تھی وہ ہیر پھیر کے ذریعہ ہونے لگی۔ قانون نے صرف برائی کی شکلوں کو بدلا ہے اصل برائی کو روکنے میں وہ بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔

حکومت دیکھتی ہے کہ کاروباری لوگ چیزوں میں ملاوٹ کر رہے ہیں، ناجائز اسٹاک رکھتے ہیں اور مختلف طریقوں سے عام پبلک کو پریشان کرتے ہیں۔ اس کو روکنے کے لئے وہ ایک قانون بناتی ہے اور اس کے نفاذ کے لئے مارکٹنگ انسپکٹروں کی ایک فوج مقرر کر دیتی ہے جو قانون کی دفعات لے کر ایک ایک دکان کو جانچنا شروع کرتے ہیں۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ دکان دار انھیں رشوت دے کر لوٹا دیتے ہیں۔ اب حکومت اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ کو حرکت میں لاتی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ بھی صرف یہ نکلتا ہے کہ جو رشوت پہلے صرف مارکٹنگ انسپکٹر لے رہے تھے اس میں ایک اور محکمہ کے لوگ حصے دار بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جب بھی حکومت کے علم میں کوئی برائی آتی ہے تو وہ اس کے خلاف ایک قانون بنا دیتی ہے یا ایک آرڈر جاری کر دیتی ہے۔ مگر اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ چلنے والے اپنا راستہ بدل کر چلنے لگتے ہیں۔ اگر کسی چیز کی درآمد و برآمد پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اسمگلنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اگر ٹیکس بڑھائے جاتے ہیں تو جعلی حسابات کے رجسٹر تیار ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کی کمی کے پیش نظر اس کے خرچ کو مقرر حد میں رکھنے کے لئے اس پر کنٹرول کیا جاتا ہے تو بلیک مارکٹنگ اور جعلی پرمٹ کا کاروبار جاری ہو جاتا ہے۔ کسی کاروبار کو قومی ملکیت میں لیا جاتا ہے تو سرکاری افسر اس قدر لوٹ مچاتے ہیں کہ نفع کے بجائے اس میں حکومت کو گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے۔ اس طوفان بے تمیزی میں اگر کوئی پکڑ لیا جائے اور معاملہ عدالت تک پہنچنے کی نوبت آئے تو وہاں بھی غلط کاروائیاں اور جھوٹی شہادتیں اس کو بچانے کے لئے موجود ہیں۔

غرض قانون اور حقیقت کے درمیان ایک طرح کی آنکھ مچولی ہو رہی ہے جس

میں ناکامی تمام تر قانون کے حصے میں آئی ہے ۔

مادی فلسفہ

دوسری چیز جو بہتر سماج کا خواب پورا کرنے کے سلسلے میں انسان کے سامنے تھی وہ مادی خوش حالی ہے ۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب لوگوں کی آمدنیاں بڑھ جائیں گی، جب لوگوں کو اپنی ضرورت کی چیزیں فراغت کے ساتھ حاصل ہونے لگیں گی تو وہ کس لئے بدعنوانی کریں گے ۔ کس لئے دوسروں کو تکلیف دیں گے، مگر واقعات سے اس نظریے کی تردید ہوتی ہے۔ بلا استثناء تمام ملکوں کا یہ حال ہے کہ وہاں جس رفتار سے مادی ترقی میں اضافہ ہوا ہے اسی نسبت سے جرائم کی رفتار بھی بڑھ رہی ہے ۔ میں یہاں اختصار کے خیال سے صرف انٹرنیشنل کریمنل پولس کمیشن کی رپورٹ کا حوالہ دوں گا جس نے دنیا کے ۴۴ ملکوں کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کئے ہیں ۔ اس رپورٹ کے مطابق غریب ملکوں میں جرائم کا اوسط ان ملکوں سے بہت کم ہے جو خوش حال ہیں، اور جن کا معیار زندگی بہت بڑھا ہوا ہے ۔ برطانیہ میں ۱۹۴۶ء میں اٹھارہ سال کا ایک لڑکا صرف دو پونڈ ساڑھے سات شلنگ فی ہفتہ کما سکتا تھا ۔ لیکن آج پونے چھ پونڈ کما لیتا ہے ۔ اور ہوشیار قسم کے نوجوان سات آٹھ پونڈ سے بھی زیادہ کما لیتے ہیں ۔ اور پھر انھیں یقین ہے کہ چند سال بعد جب وہ سن بلوغ کو پہنچیں گے تو وہ تیرہ پونڈ فی ہفتہ کی اوسط قومی آمدنی کے مستحق ہوں گے ۔

روزگار کے یہ مواقع اور یہ معیار زندگی ہندوستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۵۲ء میں ہندوستان میں ایک لاکھ آبادی کے درمیان قابل ذکر جرائم کی تعداد ۱۲۵ تھی ۔ جب کہ برطانیہ میں اتنی ہی آبادی میں ۱۳۴۲ جرائم ریکارڈ کئے گئے ۔ امریکہ جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند ملک سمجھا جاتا ہے وہاں جرائم کی تعداد ایک لاکھ آبادی میں ۱۳۲۲ تھی۔ (لیڈر ۱۸ فروری ۱۹۵۵ء) ۔ اور وہاں کے سب سے بڑے تجارتی شہر نیویارک کا تو یہ حال ہے کہ ہر ایک سکنڈ میں شدید جرم کا ایک واقعہ ہوتا ہے۔ جرائم کی اس بڑھتی ہوئی رفتار نے ترقی یافتہ ملکوں میں زندگی کا سکون برہم کر دیا ہے ۔ آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ اس کو اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آتا ہے ۔ کسی بینک کو نہیں معلوم کہ کب ڈاکوؤں کا ایک گروہ موٹروں اور مشین گنوں سے مسلح ہو کر اس کے اوپر حملہ کر دے گا ۔ کسی خاتون کو نہیں معلوم کہ شام کے وقت جب وہ دفتر سے لوٹ رہی ہوگی تو وہ راستہ میں

اغوا کر لی جائے گی یا واپس اپنے گھر پہونچے گی۔ انگلینڈ میں قاتل کے لئے موت کی سزا کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر جرائم کی بڑھتی ہوئی وبا کو دیکھ کر وہاں کے ایک مشہور اہلِ قلم اور سابق ممبر پارلمنٹ سرایلن ہربرٹ نے مطالبہ کیا ہے کہ سزائے موت کو دوبارہ جاری کیا جائے۔ اور نہ صرف قاتل کو بلکہ چوروں، نقب زنوں اور عورت کی عصمت پر حملہ کرنے والوں کو بھی یہی سزا دی جائے۔

اوپر کی گفتگو سے جہاں مادی نظریات کی ناکامی ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ ان کے اندر وہ کون سا بنیادی خلا ہے جس نے انھیں مکمل ناکامی سے دوچار کیا ہے۔ یہ خلا دراصل محرک کا خلا ہے۔ آپ ایک کارخانے کو صرف بجلی کا بٹن دبا کر حرکت میں لا سکتے ہیں۔ مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسی وقت کوئی کام کرتا ہے جب اس کے اپنے اندر اس کے کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو۔ آج دنیا کے پاس زندگی گزارنے کے لئے بہتر قسم کے کاغذی نقشے ہیں اور اس کو عمل میں لانے کے لئے جدید ترین ساز و سامان موجود ہیں۔ مگر یہ سب کچھ صرف اس لئے بے کار پڑا ہوا ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔

آج مجرمین کو پکڑنے کی ٹکنیک اتنی ترقی کر گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ملک میں جرم کر کے دوسرے مقام پر بھاگ جانے کی کوشش کرے تو اس کے سرحد پار کرنے سے پہلے ریڈیو فوٹو کے ذریعہ ساری دنیا میں اس کا حلیہ نشر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پولس کے افراد اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام نہیں دیتے، اس لئے جرم کی روک تھام کے یہ سارے مواقع بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ اقتصادیات اور اعداد و شمار کے ماہرین نہایت کامیاب طریقے پر "کم سے کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ" حاصل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر عملہ کے اندر لوٹ کھسوٹ کی ذہنیت کی وجہ سے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے وصول کی ہوئی رقم کم سے کم لوگوں کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ حکومت کی تشکیل کے لئے نہایت وسیع قسم کے جمہوری طریقے دریافت کئے گئے ہیں۔ مگر لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کے غلط استعمال کی وجہ سے جمہوریت عملاً ایک تماشا بن کر رہ گئی ہے۔

ابھی حال میں (اپریل ۱۹۶۰ء) جنوبی کوریا کے الکشن کے بعد اعلان کیا گیا کہ صدارت کے انتخاب میں ڈاکٹر سگمن رہی کو ۹۰ فی صدی ووٹ ملے ہیں۔ مگر اعلان کے بعد جب عوام نے بغاوت کر دی اور ڈاکٹر رہی کو بنا صدارتی محل چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو معلوم ہوا کہ "۹۰ فی صدی" کی حقیقت اعداد

دشمار کے دھوکے کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ سماجی اصلاح کے لئے مستقل محکمے قائم ہیں اور اس کے لئے ایسے ایسے قوانین بنائے گئے ہیں جو انسانی آرزوؤں کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں مگر عملاً یہ صرف ان لوگوں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا ایک عنوان ہے جو اس کام پر مامور کئے گئے ہیں۔ آج عالمی اتحاد کے نہایت خوبصورت نظرئے کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں اور آپس میں تعلق قائم کرنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ آپ ٹیلی فون ریسیور اٹھا کر دنیا کے کسی بھی حصے کے آدمی سے بات کر سکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے اڑ کر چند گھنٹے میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں۔ مگر انسان کے اپنے رویے کی وجہ سے یہ سارا ساز و سامان ایک مصیبت ثابت ہو رہا ہے۔ آج سائنس کی بہترین کوششیں صرف ایسے آلات تیار کرنے میں لگی ہوئی ہیں جو دم بھر میں زندہ انسانوں اور آباد شہروں کو ختم کر دیں۔

ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا یہ حال ہے کہ امریکہ کی اسٹریٹیجک ایر کمانڈ کے تین ہزار ہوائی جہاز ہر وقت آسمان میں اڑتے رہتے ہیں تاکہ اپنے ملک کو اچانک حملے سے بچائیں۔ دوسری طرف روس کی سرحدوں پر ہزاروں آدمی نہایت قیمتی آلات اور دوربینیں لئے ہوئے رات دن یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ امریکہ کا کوئی جاسوس ہوائی جہاز ان کی سرحد کے اندر تو نہیں گھس آیا ہے۔

محرک کی ضرورت

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی بہتری کے لئے آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ کوئی قانونی ڈھانچہ یا مادی ساز و سامان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا نظریہ ہے جو ذمہ داری کا احساس پیدا کرے جو آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارے کہ وہ اپنی اندرونی تحریک سے صحیح کام کرنے پر مجبور ہو اور غلط سمت میں جانے سے بچے۔ یہ کام صرف مذہب کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ چند سو برس پہلے بڑے جوش سے دعویٰ کیا گیا تھا کہ زندگی گزارنے کے سلسلے میں انسان کو مذہب کی ضرورت نہیں۔ مذہب حرام دحلال کے کچھ اصول دیتا ہے، وہ ہم اپنے قانون ساز ادارے کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مذہب دوسری دنیا کی سزا سے ڈراتا ہے تاکہ لوگوں کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو، اس کے لئے ہمارا عدالتی نظام اور ہماری جیلیں کافی ہیں۔ مذہب یہ ترغیب دلاتا ہے کہ ہمارے حکموں کو مانو تو تمہاری اگلی زندگی خوش گوار ہو گی۔ اس کے لئے بھی ہم کو موت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مادی ترقیوں کے ذریعہ ہم اسی دنیا کی زندگی کو جنت بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ تمام امیدیں واقعات

کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں۔ اور اب انسان دوبارہ اس مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ لمبی مدت تک ٹھوکریں کھانے کے بعد اب انسان کی سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ صرف کاغذی نقشے اور مادی ذرائع و وسائل کافی نہیں ہیں۔ اس کے سوا ایک اور چیز ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے۔ وہ ہے خود انسان کا اپنا جذبہ۔ اس کے اندر ایک ایسا ارادہ جو اصلاحات کی خارجی کوششوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار ہو۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسا محرک جو اندر سے آدمی کو عمل پر اکسائے، جو آدمی کو ایک دوسرے کے حقوق پہچاننے پر مجبور کرے۔

یہی اندرونی محرک تمام اصلاحات کی جان ہے۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو ساری ترقیوں کے باوجود آپس میں اس قدر چھین جھپٹ ہوگی کہ زندگی سکون سے محروم ہو جائے گی اور بہترین قسم کے معاشی منصوبے صرف ٹھیکیداروں اور انجینئروں کے لئے لوٹ کھسوٹ کا موقع ثابت ہوں گے۔

مگر تمام نظریات میں صرف مذہب ہی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی کے اندر اس قسم کا اندرونی محرک پیدا کر سکے۔ انسانی قانون بدعنوانی سے روکنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کسی عدالت میں پیشی کا حوالہ دے سکتا ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ جھوٹے بیانات اور غلط شہادتوں کے ذریعہ بہت آسانی سے اس کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ مذہب قادر مطلق کی عدالت میں حاضر ہونے سے ڈراتا ہے جس سے بچنا کسی حال میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے انسانی ساخت کا نظام کبھی بھی کوئی بہتر سوسائٹی تعمیر نہیں کر سکتا۔ یہ صرف مذہب ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ لینن نے مذہب کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمارے نزدیک آسمان پر جنت تعمیر کرنے سے زیادہ اہم کام زمین پر جنت تعمیر کرنا ہے۔" مگر تجربے نے ثابت کر دیا کہ زمین پر وہی لوگ جنت تعمیر کر سکتے ہیں جو آسمان پر جنت تعمیر کرنے کا مقصد اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ اور جن کے پیش نظر آسمان پر جنت کی تعمیر نہ ہو وہ زمین و آسمان دونوں جگہ صرف دوزخ کی تعمیر کریں گے۔

مذہب کے بارے میں یہ تصور محض ایک ذہنی اپج یا خوش عقیدگی نہیں ہے بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ پچھلی صدیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کروروں انسان اس امید میں نیکی کی راہ چلے ہیں کہ انھیں اس کا بدلہ آنے والی زندگی میں ملے گا۔ اور بے شمار لوگ محض اس خوف سے بدی سے بچتے رہے ہیں کہ کہیں ان کی بداعمالیاں انھیں عذابِ دائمی کے

حوالے نہ کردیں۔ مگر مادی دور میں اس قسم کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ آج اگر کوئی انسان بھلائی کی راہ پر چلتا ہوا نظر آتا ہے تو وہ بھی دراصل پرانے مذہبی تصورات ہی کا اثر ہے۔ ورنہ جہاں تک مادی تہذیب کا تعلق ہے وہ تو انسان کو خود غرض اور غیر ذمہ دار بنانے کے سوا اور کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس صورت حال نے تمام دنیا کے سنجیدہ انسانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت لوگوں کی سمجھ میں آنے لگی ہے کہ اصل مسئلہ انسان کا ذہن بدلنا ہے نہ کہ قانون اور معیار زندگی کو بدلنا۔ خو ہ ممالک جو مادیت کا گڑھ ہیں وہاں بھی ایسے لوگ اٹھ رہے ہیں جو بڑی شدت کے ساتھ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی ملکوں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان میں بار بار اس قسم کے فقرے دہرائے جارہے ہیں کہ " اگر نوع انسانی اپنی خیریت چاہتی ہے تو اس کو لازماً کلچر کے ایک روحانی استحکام کی طرف پلٹنا ہوگا۔" "اب اخلاقی انضباط کا دوبارہ حصول، اور روحانی نظام کی طرف واپسی انسانی بقا کے لئے ناگزیر شرط کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔" آج ایک نئی روحانی شیرازہ بندی کی ضرورت ہے۔ جس کے ذریعہ اخلاق اور کلچر کے درمیان وہ مرکزی تعلق بحال ہو جائے جو انسانی ارتقار کی ہر سطح پر اور ہر دور میں موجود رہا ہے۔" (کرسٹوفرڈاسن) ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اصل ضرورت کا احساس ہو چکا ہے مگر اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عام طور پر جن عملی شکلوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یا تو غلط ہیں یا ناقص ہیں۔

دیوار کی ضرورت

غلط شکل سے میری مراد وہ تجویزیں ہیں جو اس امید میں پیش کی جارہی ہیں کہ محض اخلاقی اپیلوں کے ذریعہ آدمی کے اندر اس قسم کا احساس پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علم بردار وہ لوگ ہیں جو مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتے مگر اخلاق کی ضرورت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا طریقہ دریافت ہو جائے کہ مذہب کی دیوار سے مدد لئے بغیر اخلاق کی چھت کھڑی ہو جائے۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اسی گروہ کی ایک مثال ہیں۔

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ میک گل یونیورسٹی میں سیاسیات کے استاد پروفیسر مائیکل بریچر نے ایک انٹرویو کے دوران ان سے سوال کیا۔ " کیا آپ مختصر طور پر مجھے بتائیں گے کہ آپ

کے نزدیک اچھے سماج کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔" وزیر اعظم نے جواب دیا۔

"میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں، وہ ہر فرد اور ہر سماجی گروپ کے لئے ضروری ہیں اور اگر وہ معیار باقی نہ رہیں تو تمام مادی ترقی کے باوجود آپ کسی قابل قدر نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان معیاروں کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ایک تو مذہبی طریقہ ہے۔ لیکن یہ اپنے تمام رسوم و تقریبات کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے۔ میں اخلاقی اور روحانی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھ کر بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ ان کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔"

ان فقروں میں پنڈت نہرو نے اپنے طبقے کے لوگوں کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ جو لوگ مذہب سے الگ رہ کر اخلاقی قدروں کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب کے سب بے یقینی میں مبتلا ہیں۔ وہ خود اپنے مقدمے کی کمزوری تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ایک چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر انہیں نہیں معلوم کہ وہ انسانوں سے اسے کس طرح منوائیں۔ انھیں اپنے خیالات کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شخص کوئی بدعنوانی کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ اس میں اسے اپنی تمنائیں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس میں اسے عزت اور دولت پانے کی توقع ہوتی ہے۔ پھر آخر کس لئے وہ اسے چھوڑ دے گا۔ کیا محض اس لئے کہ کچھ لوگ اسے اخلاق اور انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا محض کسی کے ایڈیشن کی خاطر کوئی شخص ایسا کر سکتا ہے کہ نفع کے بجائے نقصان کو اپنے لئے قبول کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انسانیت (مانوتا) کے نام پر لوگوں کو اخلاقیات کا پابند بنانا چاہتے ہیں وہ ہوا میں عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی عمارت کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

ایک مثال لیجئے۔ ہندوستانی ریلوں پر ہر بیس مسافروں میں سے ایک آدمی بلا ٹکٹ سفر کرتا ہے اور اس طرح مرکزی خزانے کو تقریباً پانچ کرور روپے سالانہ کا مسلسل نقصان ہو رہا ہے۔ اس وبا کی روک تھام کے لئے ملک بھر میں بارہ ہزار سات سو اشخاص ملازم ہیں جن پر ہر سال دو کرور انیس لاکھ روپیے صرف ہوتے ہیں۔ جب ہزاروں آدمیوں کا یہ عملہ

اور سالانہ سوا دو کروڑ روپیہ کا خرچ بلاٹکٹ سفر کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا تو حکومت نے ایک اخلاقی تدبیر سوچی۔ حکومت کی طرف سے ایک خاص پوسٹر چھپوا کر تمام اسٹیشنوں پر لگا دیا گیا۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔ Ticketless travel is a social evil یعنی بے ٹکٹ سفر کرنا سماجی گناہ ہے۔ مگر اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوا کہ کرایہ وصول نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کو جو کچھ نقصان ہو رہا تھا اس میں اس پروپگنڈے کے اخراجات کا مزید اضافہ ہو گیا۔ اصل صورت حال بدستور اپنی جگہ باقی رہی۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نقطۂ نظر بار بار کے تجربے میں قطعی طور پر ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ مگر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود ساری دنیا میں اخلاق کی اسی خیالی بنیاد پر تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ آج جو منصوبے بن رہے ہیں، جو سیاسی اور سماجی ڈھانچے کھڑے کیے جا رہے ہیں۔ وہ سب اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ افراد اور سرکاری عملہ اس کی تکمیل میں اپنا حصہ صحیح طور پر ادا کریں گے۔ اس کے بغیر کسی اسکیم کی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر حالات پکار رہے ہیں کہ یہ امیدیں بالکل فرضی ہیں۔

اس کے لئے کالج کے طلبہ کی مثال کافی ہوگی۔ کالجوں میں جو لوگ پڑھتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ آج کے شہری اور کل کے سرکاری لوگ ہیں۔ ان کی زندگی میں ہم بیک وقت دونوں کردار دیکھ سکتے ہیں۔ ان طلبہ کو اخلاق اور تہذیب سکھانے کے لئے کروروں روپیے صرف کئے جا رہے ہیں مگر ان کا حال یہ ہے کہ سال بھر کھیل کود میں گزارتے ہیں اور جب امتحان آتا ہے تو پرنسپل کو پستول دکھا کر پرچہ آؤٹ کر لیتے ہیں۔ ان کی آزادی بلکہ آوارگی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ناچ گانے کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے اگر انھیں رعایتی پاس نہ ملے تو وہ اس قدر اودھم مچاتے ہیں کہ پولس کو گولی چلانی پڑتی ہے اور سارے شہر میں کرفیو نافذ ہو جاتا ہے۔

کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بل پر ہمارے سیاسی لیڈروں نے بڑی بڑی اسکیمیں بنائی ہیں اور اس کے لئے اربوں روپئے کے ٹیکس ملک کے اوپر لاد رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سماج اور موجودہ سرکاری مشنری دونوں کسی قومی ذمہ داری کو اٹھانے کے بالکل نااہل ہو چکے ہیں۔ سڑکوں پر سے مین ہول کے ڈھکن کا غائب ہو جانا سماج کی طرف سے اس بات کا انتہائی اعلان ہے کہ وہ آپ کی کسی اسکیم کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سرکاری عملہ

کے اندر رشوت اور ناکردگی کی بڑھتی ہوئی وباصاف بتارہی ہے کہ جن ہاتھوں سے کام لیا جانے والا ہے وہ ہاتھ مفلوج ہو چکے ہیں۔ آج کے انسان کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ وہ صرف اس چیز کو مانتا ہے جس کی صداقت تجربے سے ثابت ہوگئی ہو۔ مگر یہی انسان ایک ایسے عمل پر اب تک اصرار کئے چلا جارہا ہے جس کو تجربہ رد کرچکا ہے اور جس کے حق میں نظری استدلال تو کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

عیسائیت

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کی امیدوں کا مرکز مذہبی تعلیمات ہیں ان میں ایک تو عیسائیت کو ماننے والے ہیں جو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے مذہب کو ان مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کررہے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں عیسائی مصنفین کی اچھی خاصی تعداد نے اسی قسم کے مضامین لکھنے کو اپنا مستقل موضوع بنالیا ہے۔ ان میں بعض چوٹی کے مفکرین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے اجتماعی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ مثلاً سوئزرلینڈ سے ایک تحریک اٹھی ہے جس کا نام ہے اخلاقی اسلحہ بندی (Moral Re-armament) اس کے بانی ڈاکٹر فرینک بک مین ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا پرستی کے تحت اخلاقی قدروں کو رواج دیا جائے اور لوگوں کے سوچنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ خاص طور پر ایمانداری، پاکیزگی، بےغرضی، باہمی خیر خواہی اور محبت کو پھیلایا جائے۔ اسی طرح امریکہ میں خاص اسی مقصد کیلئے ایک ادارہ (Research Centre in Creative Altruism) کے نام سے ۱۹۴۹ء سے قائم ہے جس کو ایک پبلک فنڈ سے پندرہ ہزار ڈالر سالانہ کی امداد ملتی ہے۔ اس ادارے کے ڈائریکٹر پروفیسر سوروکن (Sorokin) ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے پہلی بار اپنے تحقیق و مطالعہ کے نتائج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت سب سے اہم کام انسان کے اندرون یا اس کے نفس کی اصلاح ہے۔ جس پر تمام تر خود غرضی کا تسلط ہوگیا ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس کے برعکس اس میں بے لوث محبت کے اس جذبے کو پیدا کیا جائے اور ابھارا جائے جو آفاقی ہو۔ فرد کی اصلاح کے بغیر جو انقلاب بھی لایا جائے گا وہ بالکل سطحی ہوگا اور ساری کوششیں رائگاں جائیں گی۔ موجودہ حالات کا علاج تجویز کرتے ہوئے وہ اپنی کتاب (Crisis of our Age) میں لکھتے ہیں:

"انسان کی پوری ذہنیت اور اس کے جملہ رجحانات میں اس تبدیلی کی ضرورت ہے

جس کا رخ ان اصولوں کی طرف ہو جس کو پہاڑی کے وعظ[1] میں پیش کیا گیا تھا۔ جب اس قسم کی تبدیلی ایک خاص حد تک ہو چکی ہوگی، اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ اس نہج پر سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں بآسانی تبدیلی ہو سکے۔ لیکن اس تبدیلی کے بغیر کتنی ہی سیاسی اور اقتصادی بہتری اور میکانکی نوعیت کی تعمیر کیوں نہ کی جائے اس سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔"

ہندوازم

اس قسم کے مذہبی لوگوں میں دوسرا قابلِ ذکر گروہ جدید ہندو مفکرین کا ہے۔ سی راجگوپال اچاریہ نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے۔ *Hinduism: Doctrine and Way of Life* اس کتاب میں انہوں نے دکھایا ہے کہ آج کی دنیا کچھ روحانی تہذیبی بنیادوں کی طالب ہے اور وہ اخلاق اور کلچر جس کی جڑیں ویدانت میں اتری ہوئی ہیں، بلاشبہ اس ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔ "صنعتی انقلاب نے جو مسائل پیدا کئے ہیں عمل اور اخلاقی قدروں کے درمیان آج جو علیحدگی نظر آتی ہے، سوسائٹی کے خود غرض عناصر جس طرح قانون کے ذریعہ استحصال کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی اور معاشی میدانوں میں اس کو ناجائز کامیابی کے لئے استعمال کرتے ہیں، متضاد مقاصد کے درمیان انسانی طاقت جس بری طرح ضائع ہو رہی ہے، ان تمام خرابیوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا دنیا کو ایک ایسا مذہب پیش کیا جا سکتا ہے جو سائنس کا مخالف نہ ہو اور عملی زندگی اور ریاستی معاملات کو حق پرستی کی بنیاد پر تعمیر کر سکے۔ اور اس کے بعد خود ہی کہتے ہیں کہ Vedanta is the answer یعنی ویدانت اس سوال کا جواب ہے۔" واضح لفظوں میں "وہ لکھتے ہیں" دعویٰ یہ ہے کہ ایک اخلاقی کوڈ اور اقدار کا ایک نظام ہندو مفکرین نے مذہبی فلسفے سے

---

[1] پہاڑی کا وعظ حضرت مسیح علیہ السلام کی ایک خاص تقریر ہے جو انجیل کی پہلی کتاب میں پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں درج ہے۔ اس میں نہایت مؤثر انداز میں خدا پرستی اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے۔ راست بازی، رحم دلی، باہم صلح کرانا، صبر کرنا، حق کی روشنی پھیلانا، ناحق خون نہ کرنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، لوگوں کے حقوق ادا کرنا، عورت کی عصمت پر حملہ نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، زیادتی کا جواب نرمی سے دینا، ریا و نمائش سے بچنا، مال کی حرص نہ کرنا، اور عیب جوئی سے بچنا یہ اس کے چند خاص اجزاء ہیں۔

تیار کیا ہے جس کو ویدانت کہا جاتا ہے جو نہ صرف یہ کہ سائنس کے مطابق ہے بلکہ ایک بہتر اور مستحکم سماجی تنظیم کی نہایت عمدہ اور موزوں بنیاد بن سکتا ہے جس کی تمام دنیا کے بہترین لوگ تمنا رکھتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔"

ہندوازم موجودہ ترقی یافتہ سماج کی ضرورتوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے اس کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

بھاگود گیتا میں یہ بات نہایت واضح طریقے پر بیان کر دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنا عمل سماجی ذمہ داریوں کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے، نہ کہ منافع کی غرض سے، ہم کو اب سماجی اور اقتصادی مصلحین بتا رہے ہیں کہ اسٹیٹ اس بات کی نگرانی کرے گی کہ مرد اور عورت محض اپنے ذاتی مقاصد کے لئے کام نہ کریں۔ بلکہ اجتماعی مفاد کو بھی سامنے رکھیں۔ اور یہ بالکل وہی بات ہے جو بھاگود گیتا میں کہی گئی ہے .... اس میں نہایت واضح طریقے پر بار بار بتایا گیا ہے کہ تمام کام دیانت داری اور بے غرضی کے ساتھ اجتماعی بہبود (لوک سنگرہ) کے لئے کیا جائے نہ کہ شخصی تمناؤں کی تسکین کے لئے۔ درحقیقت گیتا نے تمام سوشلسٹ اصولوں کو نہایت عمدہ طریقے پر پیش کر دیا ہے۔ صفحات ــ ۲۲ ــ ۲۳

دونوں مذاہب پر تبصرہ

عیسائیت اور ہندوازم کی طرف سے جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کو میں بالکل بے بنیاد نہیں کہتا۔ مگر یقینی طور پر میں اس کو نہایت ناقص حل سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ انجیل اور وید میں اخلاق کے اعلیٰ اصول لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ مگر انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ محض اخلاقیات کی ایک فہرست نہیں ہے۔ اس قسم کی فہرست کا علم انسان کو بہت پہلے سے ہے اور اس سلسلے میں شاید ہم انسانی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں کر سکتے۔ آج انسان کو دراصل ایک ایسے محرک کی ضرورت ہے جو ان معلوم اخلاقیات پر عمل کرنے کے لئے ابھارتا ہو۔ وہ اس کے اندر ایسا مضبوط داعیہ پیدا کرے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے اس کو وہ کرنے لگے اور اس لحاظ سے دونوں مذاہب تقریباً خالی ہیں۔

مگر یہ خالی ہونا اس نوعیت کا نہیں ہے جیسا کہ اوپر ہم نے "اخلاق کے نام پر اخلاق" پیدا کرنے والوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ مذاہب جس طرح اخلاق کے کچھ اصول بتاتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تعلیمات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جو ان پر عمل نہیں کریگا

وہ اس کے لازمی نتیجے کے طور پر ایک برے انجام سے دوچار ہوگا۔ دونوں مذہبوں میں زندگی بعد موت کا تصور موجود ہے اور دونوں مرنے کے بعد کسی نہ کسی شکل میں اچھے یا بُرے انجام کی خبر دیتے ہیں۔ یہی دراصل وہ چیز ہے جو آدمی کو بدعنوانیوں سے روکنے والی ہے۔ یہ تصور وہاں بھی آدمی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جہاں کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ اس طرح ان مذاہب میں وہ قدر بنیادی طور پر موجود ہے جس کو اوپر ہم نے محرک عمل کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا ایک کھلا ہوا ثبوت خود ان مذاہب کی تاریخ میں موجود ہے۔ سابق دور میں ان مذاہب کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنی تھی وہ اخلاقی اعتبار سے صریح طور پر موجودہ مادہ پرست سوسائٹی سے بہتر تھی۔ مگر ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کو صحیح شکل میں محفوظ نہیں رکھا اور ان کی تعلیمات اب جس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اس قدر ناقص اور الجھی ہوئی ہیں کہ کسی وسیع اور پائدار اصلاح کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

عیسائیت کا حال یہ ہے کہ جس انجیل میں پہاڑی کا وعظ ہے اسی میں مسیحی مذہب کا یہ عقیدہ بھی درج ہے کہ نجات کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانا کافی ہے۔ اس نظرئے کے مطابق ساری دنیا خدا کے نزدیک سزا کے لائق ہے۔ کیونکہ سب نے گناہ کیا اور خدا کے جلال سے محروم ہوگئے۔ اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور اس کو سولی پر چڑھا کر "اس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا" جس کو مان کر دوسرے لوگ اپنے گناہ بخشوالیں۔ اب نجات کے لئے عمل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف "خدا کے بیٹے" کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا کافی ہے۔ کیونکہ "انسان شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔" (نئے عہدنامے کی چھٹی کتاب، باب ۳) ایسی حالت میں کوئی شخص آخر کس لئے عمل کے جھنجھٹ میں پڑے گا۔ کفارہ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد وہ کونسا محرک ہے جو آدمی کو نیکی کے لئے ابھارے اور برائی سے روکنے پر مجبور کرے۔

انجیل کا یہ تضاد ہمارے نزدیک سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کا تضاد نہیں ہے۔ مگر آج عیسائیت کے نام سے جو چیز موجود ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے۔ آں جناب نے تو مذہب کو اس کی صحیح ترین شکل میں پیش کیا تھا۔ مگر آپ کے ماننے والے آپ کی تعلیمات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ دوسروں کی تشریح و تعبیر میں شامل ہو کر اصل حقیقت گم ہوگئی۔ انجیل کو دیکھئے تو ایک طرف اس میں بہترین مؤثر انداز میں آخرت کا ذکر اور اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم

ملے گی۔ جس کو پڑھ کر آدمی کی روح بیدار ہوتی ہے اور اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وہ اگلے صفحات میں سینٹ پال کا فلسفہ پڑھتا ہے تو اس کو یہ تمام چیزیں بے ضرورت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفارہ کے عقیدے نے عیسائی مذہب میں عمل کی بنیاد کو اسی طرح کمزور کر دیا ہے جیسے کسی ملک کے دستور میں یہ لکھ دیا جائے کہ اگرچہ یہاں پولس اور عدالت کا نظام قائم رہے گا مگر کسی کو اس کی غلط روی پر سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ آدمی پاک باز رہنے پر قادر نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا معاملہ بھی تقریباً یہی ہے۔ بظاہر وہ صرف اخلاقی اپیل نہیں کرتا بلکہ سزا اور انعام کا بھی ایک نظریہ اپنے پاس رکھتا ہے جس کو "کرم" کہتے ہیں۔ یعنی اپنے کیے کا پھل پانا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں ایک صحیح نظریہ ہوگا۔ مگر اب تو وہ نہایت ناقص صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندو مذہب پر فلسفہ کا جو لمبا دور گذرا ہے۔ غالباً اس زمانے میں لوگوں کی ذہنی موشگافیوں نے اس کی ہیئت بدل دی۔ اور ایک صحیح چیز نے غلط شکل اختیار کر لی۔ اب یہ نظریہ جس صورت میں ہمارے سامنے ہے اس کو آواگون یا پنر جنم کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جیسا عمل کرتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ اگلے جنموں میں اچھے یا برے جسم میں پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کا یہ چکر برابر چلتا رہتا ہے۔ اس عقیدے کی رو سے آج جو وجود انسان، حیوان، پرند، درخت، سبزی گھاس یا کیڑے مکوڑے کی شکل میں نظر آ رہا ہے وہ سب پچھلے اعمال کے نتیجے میں ہے۔ پنر جنم کا یہ نظریہ معمولی اختلاف کے ساتھ ہندو مذہب کی تمام شاخوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس نظریے کے اوپر بھی ہماری تنقید وہی ہے جو عیسائیت کے سلسلے میں ہم لکھ چکے ہیں۔ یعنی اس کے اندر جو محرک ہے وہ نہایت ناقص اور محدود ہے۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ایسا زوردار داعیہ پیدا نہیں کرتا جس کی رغبت سے وہ اچھائی کی طرف لپکے اور جس کا ڈر اسے برائیوں سے روکنے پر مجبور کرے۔ فرض کیجئے ایک شخص کو ایک غلط کام کے لئے بیس ہزار روپئے رشوت میں مل رہے ہیں۔ کیا صرف اس لئے وہ ملتے ہوئے فائدے کو چھوڑ دے گا کہ مرنے کے بعد جب اس کا دوسرا جنم ہوگا تو اس میں وہ مچھر مکھی ہو جائے گا یا آم اور ببول کی شکل میں پیدا ہوگا۔ اینٹی کرپشن قانون کے تحت ملنے والی سزا کا خوف

اگر اس کو اس عمل سے نہیں روکتا تو اگلے جنم میں کیڑا مکوڑا یا درخت بن جاتے ہیں وہ کون سی ہولناکی ہے جو آدمی کو لرزادے اور اس کو جرم سے باز رکھے۔ اس نظریے کے مطابق وحشیانہ جرائم کی ایک بہت بڑی سزا جو منوسمرتی میں بتائی گئی ہے وہ یہ کہ ایسا آدمی دوسرے جنم میں چنڈال کے گھر میں پیدا ہوگا۔ چنڈال سے مراد پاسی، ملاح، دھوبی، ڈوم، چمار وغیرہ ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں ان قوموں کی یہ حالت رہی ہو۔ مگر اب تو ان کا لقب ہریجن (خدا والے) ہے۔ ان کو وقت کے دستور میں دوسرے انسانوں کے برابر درجہ حاصل ہے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بنگلوں اور کاروں میں زندگی گزارتے ہیں۔ حتیٰ کے ایک اچھوت لیڈر اگر الکشن میں جیت جائے تو وہ وزارت کا عہدہ حاصل کرکے برہمن آبادی کے اوپر حکومت کرتا ہے اور ان کے لئے قانون بناتا ہے۔ آخر اس طرح کے انجام میں وہ کون سا بھیانک پن ہے جو کسی کو جرم سے روکنے کا سبب بن سکے۔

اور بالفرض اگر اس سزا کی کوئی ایسی تعبیر کی جائے جس میں وہ بھیانک نظر آنے لگے تو اس کے بعد بھی اس کے اندر ایک ایسا خلا باقی رہتا ہے جو آدمی کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر آپ ایک تباہ حال آدمی کو لیں اور اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنے پچھلے جنم میں کیا کیا تھا جس کے نتیجے میں یہ انجام بھگت رہے ہو تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں آئے بھی تھے یا نہیں۔ پنر جنم کے عقیدے کے مطابق انسان کو اس کے عمل کا بدلہ دینے کا معاملہ بالکل بے خبری میں انجام پاتا ہے اور یہ بے خبری پنر جنم کی تمام شکلوں میں موجود ہوتی ہے۔ جن احساسات رکھنے والے ایک وجود نے اپنی زندگی میں ایک کام کیا تھا۔ اس کو جب اپنے اس عمل کا انجام ملتا ہے تو وہ اپنے پچھلے وجود کو بھول چکا ہوتا ہے۔ کیا ایسے ایک واقعہ کو سزا کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے بے ہوشی کا انجکشن دے کر کسی کی چیر پھاڑ کی جائے۔ بلکہ زیادہ ٹھیٹ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے آج کے عمل کا بدلہ کل دوسرے شخص کو ملے گا اور میری آج کی بد اعمالیوں کی سزا کل کسی اور کو بھگتنی پڑے گی۔ مرنے کے بعد جب میں اپنے موجودہ شعور اور موجودہ احساسات کے ساتھ ختم ہو جاؤں گا تو اس کے بعد کی پیدائش کو میری پیدائش کیوں کہا جائے۔ پھر جس عمل کا انجام میرے بعد

دوسرے انسان کو ملنے والا ہے اس لئے آخر میں کیوں کوشش کروں اور جب بدعملی کی سزا دوسرے وجود کو بھگتنی ہے اس سے میں کیوں ڈروں۔ پنرجنم میں روح کے قالب بدلنے کو جس شکل میں پیش کیا گیا ہے ممکن ہے اس کو منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحثوں کے ذریعہ ایک انسان کا مختلف جنم قرار دیا جا سکے مگر قطعی طور پر یہ ایک لفظی استدلال ہوگا۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ اس طرح کے مختلف جنموں کو ایک انسان کا جنم کس بنا پر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اس نظریے کے اندر انسانی کامیابی کا جو تصور دیا گیا ہے اس میں بھی ہمارے لئے کوئی کشش نہیں ہو سکتی۔ پنرجنم کے مطابق انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی روح مختلف قالبوں میں پیدا ہو کر ارتقاء کرتی رہے یہاں تک کہ بالآخر خدا یا پرماتما کے وجود میں گم ہو جائے جس کو نجات یا نروان کہا جاتا ہے۔ یہاں مجھے اس نظریے کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے بحث نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کے ایک نظریے میں وہ کون سی کشش ہے جس کے لئے آدمی دنیا کے دکھ جھیلے اور زندگی بھر خواہ مخواہ ذمہ داریاں پوری کرنے اور حقوق ادا کرنے کا کھڑاگ اپنے سر مول لے۔ اس کامیابی میں انسان کو کیا ملا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ پرماتما کی اپنی تکمیل کہا جا سکتا ہے نہ کہ کسی انسان کا ارتقاء۔ پھر جس عمل کا فائدہ تمام تر دوسرے کو ملنے والا ہو اس میں آدمی کیوں محنت کرے۔ ممکن ہے کچھ مخصوص قسم کے فلسفیانہ ذوق رکھنے والے لوگوں کو اس طرح کے نامعلوم ارتقاء سے دلچسپی ہو۔ مگر عام انسان جن جذبات اور جن تمناؤں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اس کے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہو سکتی اور صرف یہ واقعہ فلسفۂ نروان کے خلاف فطرت اور خلافِ واقعہ ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

اسلام

اس مختصر جائزے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کون سا دھرم سب سے بہتر ہے۔ اس کا جواب اسلام کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تمام خصوصیات اس کے اندر مکمل ترین شکل میں موجود ہیں جو ایسے ایک دھرم میں ہونا ضروری ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کی طرف سے میں کسی ایسی چیز کا انکشاف کرنے والا ہوں جس کی

ضروری ہیں مگر ان کی حیثیت روح کے ساتھ جسم کی سی ہے۔ روح کے ظاہر ہونے کے لئے ایک جسم کا ہونا ضروری ہے۔ مگر کسی انسانی وجود میں اصل چیز اس کی روح ہوتی ہے نہ کہ جسم۔ اگر یہ روح نہ ہو تو جسم خواہ کتنی ہی مکمل حالت میں موجود ہو ہم اس سے انسان کا کام نہیں لے سکتے۔ اس طرح بہتر زندگی کی تعمیر کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ انسان کی اپنی اصلاح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو زندگی کی پوری اسکیم میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ موجود ہو تو دوسری تمام چیزیں ٹھیک ٹھیک کام کریں گی اور اگر یہ نہ ہو تو کوئی بھی خارجی نقشہ ہمارے مسائل کو حل نہیں کر سکتا۔

زندگی کے اس اہم ترین سوال کا جواب اسلام کے اندر انتہائی مکمل اور صحیح شکل میں موجود ہے۔ اسلام سب سے پہلے یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کوئی الل ٹپ جگہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک خدا ہے جو اپنی زبردست طاقت کے ذریعہ پوری دنیا پر فرماں روائی کر رہا ہے۔ اس طرح وہ انسان کے اندر ایک ایسی طاقت کا عقیدہ پیدا کرتا ہے جس کی پکڑ سے انسان اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اور نہ اس سے بھاگ کر کہیں جا سکتا۔ وہ زندگی کے بارے میں یہ تصور دیتا ہے کہ وہ دو مرحلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور موجودہ مرحلہ اگلے مرحلے کی تیاری کے لئے ہے۔ ہم آج جو کچھ کریں گے اس کا اچھا یا برا بدلہ اگلی زندگی میں پائیں گے۔ اس طرح آدمی کے اندر آئندہ زندگی میں کامیاب بننے کی طلب پیدا ہوتی ہے اور دنیا کی حرص جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے اس کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب ٹرین سامنے کھڑی ہو تو کوئی شخص پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے جھگڑا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو شخص دنیا کی بے ثباتی اور اگلی زندگی کی اہمیت کو سمجھ جائے اس کے لئے ناممکن ہے کہ دنیوی منافع کے لئے لوگوں سے چھین جھپٹ کرے۔

آج چمبل کی وادی (ضلع آگرہ) میں ۲۵ ہزار پولس گھیرا ڈالے پڑی ہے مگر ڈاکوؤں کا گروہ اس کے قابو میں نہیں آتا۔ اسلام فرشتوں کی ایک ایسی پولس کا تصور دیتا ہے جو ہر انسان کے دونوں کندھوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار کر رہی ہے۔ جو مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ خیال آدمی کو اپنے تمام کھلے اور چھپے معاملات میں چوکنا کر دیتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ مستقل طور پر ایسی پولس کے پہرے میں ہے جس سے پیچھا چھڑانے کی کوئی سبیل نہیں۔

دوسری دنیا کے بارے میں اسلام یہ تصور دیتا ہے کہ وہاں جنت اور جہنم ہے۔ جنت انتہائی عیش کی جگہ ہے اور جہنم بدترین عذاب کا مقام۔ وہ تمام لذیذ اور بہترین چیزیں جن کی انسان تمنا کر سکتا ہے اسلام ایک ایک کا نام لے کر بتاتا ہے کہ وہ نہایت اعلیٰ شکل میں جنت میں موجود ہوں گی۔ اور سخت ترین عذاب کی تمام صورتیں جن سے انسان آشنا ہے، ان کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ جہنم میں جانے والے شخص کو بھگتنا پڑیں گی۔ ہر وہ انسان جو پیدا ہوا ہے اس کو ہمیشہ ہمیش کے لئے ان میں سے کسی ایک میں رہنا ہے۔ یہ چیز آدمی کو بے قرار کر دیتی ہے اور وہ اپنے ایک ایک لمحے کو فضولیات سے بچا کر صحیح ترین کام میں لگانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس خدا کی عدالت میں تمہارا معاملہ جانے والا ہے اس پر نہ کسی کا زور ہے اور نہ کوئی سفارش وہاں سنی جانے والی ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے حضور اپنی زبان کھول سکے۔ یہ چیز اس کو بتاتی ہے کہ جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنا چھوڑ دے۔ اور صرف خدا سے اپنا تمام تعلق قائم کرے۔ پھر یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح پیش آئے گا کہ ہم اپنے موجودہ احساسات کے ساتھ اپنی زندگی کا شعور رکھتے ہوں گے۔ اپنی پچھلی زندگی ہر شخص کو اچھی طرح یاد ہوگی بلکہ اس کے سامنے ہوگی۔ موت اس کے لئے محض نیند کی طرح کا ایک درمیانی وقفہ ہوگا اور وہ دوسری زندگی کو اسی طرح اپنی زندگی سمجھے گا جس طرح سو کر اٹھنے والا کوئی شخص سمجھتا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو اسی طرح پہچانے گا جس طرح وہ آج پہچانتا ہے۔ غرض آج ہمارا جو وجود ہے، اسی وجود کے ساتھ ہم اپنی جزا یا سزا پائیں گے۔

اس طرح اسلام کا آخرت کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو آدمی کو ہلا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس نظریے میں اس بات کی مکمل صلاحیت ہے کہ وہ سماج کی ضرورت کے مطابق نہایت فرض شناس اور دیانت دار شہری پیدا کرے اگر اس نظریے کو کسی آبادی میں وسیع پیمانے پر پھیلایا جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کو اچھی طرح بٹھا دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ حساس اور ذمے دار بن جائینگے۔ جب ایک شخص کو منتخب کر کے کسی کام پر لگا دیا جائے گا تو وہ اس احساس کے تحت اپنی ڈیوٹی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے گا کہ اس کا جواب اسے مالک کائنات کو دینا ہے جو اس

کی تمام سرگرمیوں سے باخبر ہے، جس کی نگاہ سے اس کا کوئی چھوٹا یا بڑا کارنامہ چھپ نہیں سکتا۔

مدینے کے ایک باشندے ابومسعود انصاری کا واقعہ ہے، وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اتنے میں انہوں نے پیچھے سے ایک آواز سنی ــــــ اعلموا ابامسعود للّٰه اقدر علیك منك علیه (ابومسعود! یاد رکھو اس غلام کے اوپر تم کو جتنا اختیار ہے، تمہارا خدا اس سے زیادہ تمہارے اوپر اختیار رکھتا ہے) دیکھا تو حضرت محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کھڑے تھے۔ یہ فقرہ سنتے ہی ان کا حال بدل گیا۔ انہوں نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا اور بولے کہ اے خدا کے رسول! میں اس غلام کو خدا کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو جہنم کی آگ تمہیں پکڑ لیتی۔ (مسلم) اس طرح اسلام ایک ایسا نظریہ عطا کرتا ہے جس کے ذریعہ آپ کسی بھی شخص کو کسی بھی مقام پر ٹوک سکتے ہیں اور وہ خود اپنے فائدے کی خاطر مجبور ہوگا کہ اس کی تنبیہ پر غور کرے۔ جبکہ موجودہ نظام میں کسی کو بدعنوانی سے روکنے کے لئے صرف پولس کے دفتر میں اس کی رپورٹ درج کرائی جا سکتی ہے، ایک ایسا دفتر جو رشوت لے کر اپنا ریکارڈ جلا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت میں بھی جانا ہو تو ملزم کو خوب معلوم ہے کہ ایک قابل وکیل کو فیس ادا کرنے کی صلاحیت ہونا کسی بھی مقدمے کو جیتنے کی کافی ضمانت ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی سطروں میں میں نے اسلام کے تصورِ زندگی کو اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ آج ہم جن مسائل میں گھرے ہوئے ہیں، ان کو وہ کس طرح حل کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی اس کی کل حیثیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کوئی فرضی نظریہ نہیں ہے جو مسائل پیش آنے کے بعد ضرورت کے طور پر گھڑ لیا گیا ہو۔ حل مسائل کی غرض سے ہم دنیا کو کوئی فلسفیانہ فریب نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال کہ "زندگی کے مسائل کا حل کیا ہے۔" یہ بذاتِ خود کوئی الگ سوال نہیں۔ بلکہ وہ اس بڑے سوال کا جزو ہے کہ "زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے۔" حقیقت سے مطابق ہونے ہی کا دوسرا نام مسائل کا حل ہونا ہے۔ جس نظامِ فکر کو اپنانے سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں، یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہی نظامِ فکر کائنات کی اصل حقیقت ہے اور کسی نظامِ فکر کا

اصل حقیقت ہونا خود بخود یہ معنی رکھتا ہے کہ اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

خاتمہ

اس وقت میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مقصد ذہنی طور پر آپ کو اس مقام تک پہنچانا ہے جہاں سے آپ اپنی منزل کو دیکھ سکیں۔ اور ان سوالات کا جواب پالیں جو آپ کو اور ساری انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنے لئے کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کو میری بات لازماً صحیح نظر آنی چاہئے۔ میں آپ کو اختلاف کا حق دیتا ہوں۔ مگر یاد رکھئے کہ جب کسی معاملے میں آدمی کو اپنی رائے مختلف نظر آتی ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی حقیقی رائے ہو۔ اکثر رائیں محض آدمی کے موروثی جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آدمی کہتا ہے کہ "میرا خیال یہ ہے" حالانکہ وہ دراصل ماحول کا خیال ہوتا ہے جس کو وہ اپنا سمجھ کر دہرا دیتا ہے۔ عقیدے، رائیں اور تعلقات بیشتر حالات میں تاریخ اور ماحول کے اثر سے بنتے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جنہوں نے فی الواقع اپنے خاندان اور اپنے گرد و پیش سے اوپر اٹھ کر خالص عقلی غور و فکر کے نتیجے میں کوئی عقیدہ اپنایا ہو، کوئی رائے قائم کی ہو یا کسی سے اپنے تعلقات جوڑے ہوں۔ اس لئے آج آپ جس عقیدے کو اپنا عقیدہ اور جس طریق زندگی کو اپنا طریق زندگی کہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ واقعہ بھی ایسا ہی ہو۔ بہت ممکن ہے کہ ایک مخصوص خاندان میں پیدا ہونے کی وجہ سے یہ چیزیں آپ کے ساتھ چمٹ گئی ہوں۔ میں آپ کو یہی معلوم کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ آپ سوچئے کہ آپ نے جس عقیدے کو اپنا رکھا ہے وہ فی الواقع آپ کی سوچی سمجھی راہ ہے یا محض باپ دادا کی پیروی میں آپ بے سوچے سمجھے اس پر چلے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ ان دونوں کے فرق کو سامنے رکھیں گے اور وراثتی جذبات اور ماحول کے تاثرات سے الگ ہو کر اپنی راہ ڈھونڈھنے کی کوشش کریں گے تو لازماً میری تائید کریں گے اور اس وقت آپ کو صاف نظر آئے گا کہ حقیقتہً انسان کی منزل کس طرف ہے۔

نوٹ: یہ مقالہ آریہ سماج (الہ آباد) کے ایک جلسہ میں پیش کیا گیا جو سرو دھرم سمیلن کے عنوان سے ۲۲ مئی ۱۹۶۰ کو ہوا تھا۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی: ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ــــــ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ــــــ الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

December 1983
Issue No. 85

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اوّل ہدیہ	50/-
الاسلام	20/-
مذہب اور جدید چیلنج	20/-
ظہور اسلام	20/-
احیاءِ اسلام	12/-
پیغمبرِ انقلاب	20/-
دین کیا ہے	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	3/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	1/-
تعارفِ اسلام	2/50
اسلام پندرھویں صدی میں	2/-
راہیں بند نہیں	3/-
ایمانی طاقت	3/-

اتحادِ ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	4/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبرِ اسلام	2/-
منزل کی طرف	6/-
حقیقتِ حج	1/-
اسلامی دعوت	3/-

تعارفی سٹ

سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	3/-

ENGLISH PUBLICATIONS

The Way to find God	3/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	4/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Mohammad : The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ □ جمعیۃ بلڈنگ □ قاسم جان اسٹریٹ □ دہلی ۶